لحاف

عصمت چغتائی

لحاف

عصمت چغتائی

فہرست

عصمت چغتائی بقلم خود	صفحہ	۵
لحاف	"	۱۷
تیسرا دورہ	"	۳۵
کشتے	"	۵۱
عشق کا بھوت	"	۶۵
ثواب	"	۷۹
کوسنے	"	۱۰۰
جنم جنم کی پیاس	"	۱۲۱
آنٹی	"	۱۳۹

لحاف

عصمت چغتائی

سیما پبلی کیشنز

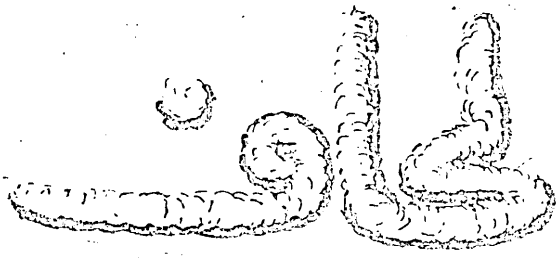

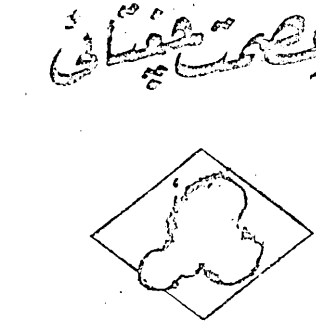

جب میں سوئی تو ربو ویسی ہی بیٹھی اُن کی پیٹھ کھجا رہی تھی بھنگن کہیں کی" میں نے سوچا۔

رات کو میری ایک دم آنکھ کھلی تو مجھے عجیب طرح کا ڈر لگنے لگا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا اور اس اندھیرے میں بیگم جان کا لحاف ایسے ہل رہا تھا جیسے اس میں ہاتھی بند ہو۔

"بیگم جان!" میں نے ڈری ہوئی آواز نکالی۔ ہاتھی ہلنا بند ہوگیا۔ لحاف نیچے دب گیا۔

"کیا ہے سو رہو!" بیگم جان نے کہیں دور سے آواز دی۔

"ڈر لگ رہا ہے۔!" میں نے چوہے کی آواز سے کہا۔

"سو جاؤ۔ ڈر کی کیا بات ہے؟"

عصمت چغتائی

ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پور م پور اپنی ننھیال والوں پر گئی ہوں۔ نگوڑے شیخ پتلی دال کھانے والے۔ مگر ننھیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فیصدی ددھیال والوں پر پڑی ہوں۔ وہی اپنی پھوپی جیسا تیہا اور گز بھر کی زبان۔ چنگیز خاں کی اولاد سے اور کیا امید کی جاسکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی اماں سے پوچھتا کہ بیٹی کو کیا ہوگیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔

"نہ ددھیال کا قصور نہ ننھیال، یہ سب نصیب کا پھیر ہے!"

ایسی [illegible]ت میں کس کا نام لے دوں۔ وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا۔ ضرور پالنے پوسنے میں کہیں بھول چوک ہو گئی۔

مگر مجھے بذات خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ پھر پھر بچوں کے جم غفیر میں ایک پا پیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی۔ نہ نذر دکو کبھی کسی کی زندگی کا اہم

حقہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اس لیے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی کھیل کود کا زمانہ انہیں کے ساتھ گلی ڈنڈا، فٹ بال، اور ہاکی کھیل کر گزرا۔ پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی۔ سچ پوچھیئے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پہ درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر سے دوپٹہ اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پہ شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے۔ کنبہ کا کنبہ حد درجہ بامذاق اور باتونی، آپس میں چوٹیں چلتیں، نئے نئے جملے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں، بچے بچے کی زبان پہ سان رکھ جاتی۔

ابا پنشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے لگے۔ کھلی ہوا میں اڑنے کے بعد ایک دم سے نہایت بوسیدہ ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنجہ شاہی کی بوسیدہ گلیاں اور ان گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھکی جھکی نیم مدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جائیں۔ میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنی اور ان بڑھیوں سے بھی ٹھن گئی۔ جو مجھے چھجوں پہ قلانچیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں۔

"نوج بوا، پھُو کی لونڈیا ہے کہ موا بجار توبہ توبہ"

اور میری اماں جان نصرت خانم جنہیں لوگ پیار میں پھُو کہتے تھے شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔

اور آگرہ کی ان مردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خدا نے کیوں پیدا کی۔ مری پٹی مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت تھی، دھوبن روز رات

کو پٹتی تھی۔ بھترا تی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں۔ اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی۔ اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ پٹوں۔ گلیوں میں کبڈی کھیل سکوں۔ اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں۔ مگر آگرہ میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں، ان گلیوں میں سارے دور اور قریب کے رشتہ دار بھی رہتے تھے۔ جن سے اماں لڑا کرتیں۔ جب تک دوسرے شہروں میں رہتے آزاد رہے اپنے کنبہ میں آکر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرہ کی ان شرمیلی دبی دبائی لڑکیوں سے مجبوراً بہناپا جوڑنا پڑا! اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ظاہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتی پرزہ ہیں۔ چھپ کر وہ گل کھلائے جاتے ہیں کہ الٰہی توبہ۔ بڑھیوں کو چٹکیوں میں اڑا کر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پینگیں بڑھتی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہت آئی۔

آگرہ کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا۔ اور ہم لوگ علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو بھی کچھ خاندان والوں سے وحشت ہوتی تھی۔ علی گڑھ کی کھلی ہوا میں پھر ہماری پرانی زندگی لوٹ آئی۔ . . . دبی پھوس کے بنگلے ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت، اور ان کھیتوں میں ککڑیاں کھیرے چرانا، پیڑوں پر چڑھنا، اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا۔ بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے۔ مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے۔ اور نہ ان کی بالیوں میں انگلی ڈال کر جھٹکے دیئے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے۔ اور سب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاکسار ہی ایک لڑکی تھی جس کی شکایتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں۔ مگر بھائی اتنے بدنام ہو چکے تھے کہ کم ہی سزا انہیں ملتی۔ اس لئے ڈانٹ دیئے جاتے۔

ملی گڑھ آکر عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انہیں مجھ سے کیوں ایک دم دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے۔ ان سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے نہ چپتیں مارتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر انہوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ابتدا کیسے ہوئی۔ مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے تھکے ہارے آتے تھے۔ تو اپنے برآمدے میں پلنگ پہ لیٹ جاتے تھے۔ اور مجھ سے کہتے۔ زور زور سے پڑھو۔ پھر ترجمہ درست کرتے، املا لکھواتے اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں تھیں جن سے ابتدا ہوئی۔ بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو۔ انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں۔ دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کا ترجمہ کرنے میں کئی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پوری ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی۔ اور اسی زمانے سے مجھے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا۔ ساری ساری رات ناولیں پڑھیں خاک سمجھ نہیں پڑا لہٰذا پھر پڑھنا پڑیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناولسٹ تھا۔ جسے میں نے بقول عظیم بھائی قبول کر لیا۔

اس زمانہ میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل ان کی آواز بازگشت بن گئی۔

"منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔" جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں۔ اور عظیم بھائی نے بھی میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے، بڑی ہشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں پھٹ سے کہہ دیتی۔ کسی دور بقول خاندان والوں کے انہوں نے مجھے خوب بھڑکایا میری

طبیعت جو پہلے ہی خود سر اور ضدی تھی۔ ان کی شہ پا کر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی انہیں حرارت ہو جاتی، کبھی سینے میں درد ہوتا، ہاتھ پیر اینٹھتے، ان کی بیوی، بیٹی ان کی چھاتی سینکا کرتیں۔ اور وہ مجھے پڑھایا کرتے انہوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا۔ اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی جو تھے۔ اس لیے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔

ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑا۔ دو گھنٹے ہو گئے اور چند صفحوں کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

"ہم نہیں پڑھتے آپ سے، آپ اتنا تو کھانستے ہیں" میں نے جل کر کہا۔

"بیوقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں" انہوں نے ہنس کر کہا۔ اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتہ نہیں انہیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہو گئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے چھٹیوں میں انہوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا چونکہ اب وہ جودھپور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انہوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ جناب اسمٰعیل، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے۔ اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئن تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کیے۔

مثلاً میں بہت خوبصورت ہوں، بالکل حجاب امتیاز علی کی ہیروئن کی طرح سنہرا بال نیلی آنکھیں۔ . . . قرمزی رنگ کا لبادہ اوڑھے نیم دراز ہوں، ہیرو آتا ہے۔ . . میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آ کر نبض ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہتا۔ میری حالت خراب ہونے پہ زار و قطار روتا۔ بے تابانہ مجھے چومتا اور میری حسین موت پہ ڈاڑھیں مار کر روتا اور عموماً خودکشی کر لیتا۔ کیا مزیدار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں۔ انہیں لکھنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا ہے۔ جیسے رومانی ناول میں جب ہیرو ہیروئن کے لبوں کا بوسہ لیتا ہے تو پڑھنے والے کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال لکھنے میں بھی ہوتا ہے۔ عموماً ایسی کہانیاں لکھ کر میں فوراً پھاڑ ڈالا کرتی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ "گندی" ہیں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتہ کاری ہو گی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں پھر لکھ کر دوبارہ تبارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہیں۔ اور واقعی وہ میری تصنیف نہ تھی اور نہ میرا روزنامچہ تھیں بلکہ وہ ان کہانیوں کا نچوڑ تھیں جو مجھے بھا چکی تھیں۔

ایسی کہانیوں کا میرے سرہانے انبار جمع ہو گیا اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔ ایک دن شمیم جو عمر میں مجھ سے سال ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سرہانے کا غذ سرسرائے تو نکال کر پڑھنے لگے۔

"آہاہا . . . بھلتی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں، توبہ توبہ"

شمیم صاحب نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا۔

"ڈاکٹر جمیل نے اپنا سفید براق ہاتھ میرے سینے پہ رکھا اور میرے گلابی ہونٹ . . ."

میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی۔ سر میں بیسن ڈال چکی تھی، اف وہ بیان نہیں

کرسکتی کہ کیا حالت ہوئی . . . . یا خدا اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانہ نہ رہے گا۔

ہیبت زدہ ہو کر میں نے غسل خانہ ہی سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا اور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بیچارہ کاغذ پھینک پھانک میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے الٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منہ نوچ ڈالا۔ وہ [illegible] بس منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں نے اسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔ شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلا دیا کہ ٹرانسلیشن تھا۔ وہ بیچارہ پہلے سے [illegible] کا جھوٹا مشہور تھا۔ اس لیے کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔

اب بھی اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شمیم کے کوئی دوسرا بھائی پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آجاتی۔ بس اس دن سے میں نے توبہ کی کہ اول تو ایسی بیہودہ کہانیاں لکھوں گی ہی نہیں جو اگر لکھیں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔ حالانکہ اب غور کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ادبی چونچالی کے جو مجھے نہایت پھس پھسی لگنے لگی تھی۔

پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی۔ اے کے بعد دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چار سال میں انسان کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ میٹرک کے بعد چار سال میں نے کورس کی کتابیں مجبوراً پڑھیں ورنہ ان ڈرامہ بیشن پلے اور شیکسپیئر سے لے کر ابسن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنارڈ شا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈرامہ فسادی برنارڈ شا سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا۔ مواد میں نے اپنے ارد گرد سے لیا اور اینٹ گارا برنارڈ شا سے سیکھا۔ بی۔ ٹی کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حیدر مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا

کرتی۔ اس لیے میں نے دو ایک برنارڈ شا کے شکنجے سے نکل کہانیاں لکھنا شروع کیں۔

اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا۔ جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ روشن آنکھوں اور مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر ہمنا نہ جلنے۔

پہلی دفعہ میں نے انہیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کڑکڑاتے جاڑے میں بیویاں موٹے موٹے دوشالے اور کوٹ ڈالے پنڈال کے اندر سوں سوں کر رہی تھیں۔ اور رشیدہ آپا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے دھواں دھار کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور گھنگھریلے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے سامنے کی کھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں۔ ان کے کٹے ہوئے بالوں پر بغیر آستین کی بلاؤز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے آتی ہوئی برفیلی ہوا پر۔ مگر ان کی تقریر بھی شاید کچھ کم خاردار نہیں تھی کیونکہ تقریر کے بعد انہیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بے باکی کا تہلکہ مچ گیا تھا۔ اور میں نے بے سمجھے بوجھے ان کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر چن لیا تھا۔

۳۸ء میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔ اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ میرا حسین ڈاکٹر ہیرو، شمعی انگلیاں، نازنگی کے شگوفے اور قرمزی لبادے چھو ہو گئے۔ مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے سنگ مرمر کے سارے منہدم کر دیئے زندگی ننگی ہم سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ ان سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا تھا۔ جی چاہتا انہیں کھا جاؤں، کیا کر دوں، جو رشیدہ آپا سے مل چکے ہیں۔ وہ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ اگر میری ہی کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جیٹھانی

نظر آئیں۔ کیونکہ انجانے طور پر میں نے رشیدہ آپا ہی کو اٹھا کر افسانوں کے طاقچہ میں بٹھا دیا۔ کہ میرے تصور کی دنیا کی ہیروئن صرف وہی ہو سکتی تھیں۔ مگر جب خود سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے میں نے ان کی بیباکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا۔ ان کی بھرپور سیمابی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت ہے۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں سب مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقوی دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ۔

یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سو لڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں؟ کے مخمصہ میں پڑ کر سارا ہی راستہ گم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے اور پرانے بچھڑ گئے اور بکھر گئے۔

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

انجمن کے پیچھے اڑ گئے۔ بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھا کرتی تھیں فلموں میں غرق ہو گیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لیے لکھ کر روزی نہیں کمائی جا سکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہو سکتا ہے۔

فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نرمی یا کمی کی دھونس چلتی ہے۔ نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہیئے جو چھپّڑ پھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

فسادات کے بارے میں تجربہ سنی سنائی ہے۔ آگے نہ بڑھ پایا۔ "دھانی بانکیں" اور جڑیں سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی۔ مگر ان دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور سے قلابازی لگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں ان میں ماں باپ یا تو تھے ہی نہیں۔ اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ انہیں نظر انداز کر کے ہی میری دانست میں ان پر فتح پائی جا سکتی ہے۔ والدین سڑک کا روڑا ہی تو ہیں۔ جو اولاد کے راستے میں رکاوٹوں کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے۔ "یہ نہ کرو" "وہ نہ کرو"۔ اب تک میرے دماغ میں بسا ہوا تھا۔ لیکن یہ دو مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

سب انہیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ میں ان سے ملنے جودھپور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے سامنے ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہو گئی تھیں۔ ہمارا وسیع مکان رفیوجیوں کے قبضہ میں تھا۔

میں پہنچی تو ڈھنڈار اُجڑے ہوئے کمرے میں میری اماں بیٹھی تھیں۔ اماں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی انہوں نے محبت کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اپنے قیام کے زمانہ میں بار بار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر تک رہی ہیں۔ جہاں بھرے پُرے خاندان کے ساتھ ہم سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ قلانچیں بھرتے تھے۔ لڑائیاں ہوتی تھیں۔ ملاپ ہوتے تھے۔

میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا۔ ان کے اکیلے پن کو دیکھا۔ موٹے تازے دس

پیدا کرکے بھی وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان ابل آیا۔ ممتا جاگ اٹھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا اور ان دو ہستیوں کے بیچ میں خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ ساری دنیا کی بڑھیوں پر پیار آنے لگا۔ جو دنیا کو بساتی ہیں۔ مر مر کر جنم دیتی ہیں۔ انہیں پالتی پوستی ہیں۔ جو کچھ ان پہ نچھاور کرتی ہیں نہ ان سے اسٹامپ لکھاتی ہیں نہ پیسے کا غذ پر رسید۔ اب اگر اولاد ان کے بڑھاپے کا خیال کرے تو فرمانبردار ہے۔ جو اپنے بال بچوں کے خرچ سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھوں کو لوگ بیکار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر مہیب شے ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا جو میری اپنی اماں سے ملاقات ہو گئی۔ اور کچھ سوئے ہوئے تار جاگ اٹھے۔ ابھی کتنے تار ہیں جو مردہ خاموش سوئے پڑے ہیں۔ کہاں جانے کون سے نئے مضراب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی نیندیں ٹوٹیں گی۔ ٹھہرے ہوئے پانی پہ کائی جم جاتی ہے۔ ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرتا ہے۔ . . . کائی چھٹ جاتی ہے . . . . جگمگاتی دنیا کا عکس پانی کی سطح پہ لو دینے لگتا ہے۔ انسان ایک قدم آگے بڑھاتا ہے۔

چاندی کا گھاؤ

کرشن چندر

لحاف

جب میں جاڑوں میں لحاف اوڑھتی ہوں تو پاس کی دیوار پر اس کی پرچھائیں ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ایک دم سے میرا دماغ بیتی ہوئی دنیا کے پردوں میں دوڑنے بھاگنے لگتا ہے نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا ہے

معاف کیجئے گا میں آپ کو خود اپنے لحاف کا رومان انگیز ذکر بتانے نہیں جا رہی ہوں نہ لحاف میں کسی قسم کا رومان جوڑا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں کمبل کم آرام دہ سہی مگر اس کی پرچھائیں اتنی بھیانک نہیں ہوتی جتنی ..... جب لحاف کی پرچھائیں دیوار پر ڈگمگا رہی ہو۔ یہ جب کا ذکر ہے جب میں چھوٹی سی تھی اور دن بھر بھائیوں اور ان کے دوستوں کے ساتھ مار کٹائی میں گزار دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ میں کم بخت اتنی لڑاکا کیوں تھی۔ اس عمر میں جبکہ میری اور بہنیں عاشق جمع کر رہی تھیں میں اپنے پرائے ہر لڑکے سے جوتم پیزار میں مشغول تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اماں جب آگرے جانے لگیں تو ہفتہ بھر کے لئے مجھے اپنی ایک منہ بولی بہن کے پاس چھوڑ گئیں۔ ان کے ہاں اماں جانتی تھیں کہ چوہے کا بچہ بھی نہیں اور میں کسی سے بھی لڑ بھڑ نہ سکوں گی سزا تو خوب تھی میری۔!

ہاں تو اماں مجھے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ وہی بیگم جان جن کا لحاف اب تک میرے ذہن میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہے۔ یہ وہ بیگم جان تھیں جن کے ماں باپ نے نوابصاحب کو اس لئے داماد بنالیا کہ گو وہ "پکی" عمر کے تھے مگر تھے نہایت نیک کبھی کوئی رنڈی یا بازاری عورت ان کے یہاں نظر نہ آئی خود حاجی تھے بہنوں کو حج کرا چکے تھے۔

مگر انہیں ایک نہایت عجیب و غریب شوق تھا۔ لوگوں کو کبوتر پالنے کا جنون ہوتا ہے، بٹیریں لڑاتے ہیں۔ مرغ بازی کرتے ہیں اس قسم کے واہیات کھیلوں سے نواب صاحب کو نفرت تھی۔ ان کے یہاں تو بس طالب علم آتے تھے۔ نوجوان گورے گورے پتلی کمروں کے لڑکے جن کا خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔

مگر بیگم جان سے شادی کر کے تو وہ انہیں کل ساز و سامان کے ساتھ ہی گھر میں رکھ کر بھول گئے اور وہ بیچاری دبلی پتلی نازک ہستی بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگیں۔

نہ جانے ان کی زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں

سے جب پیدا ہونے کی غلطی کر چکی تھیں۔ یا وہاں سے جب ایک نواب کی بیگم بن کر آئیں اور چھپر کٹ پر زندگی گزارنے لگیں یا جب سے نواب صاحب کے ہاں لڑکوں کا زور بندھا ان کے لئے مرغن حلوے اور لذیذ کھانے جانے لگے اور بیگم جان دیوان خانہ کی درازوں میں سے ان کی لچکتی کمروں والے لڑکوں کی چست پنڈلیاں اور معطر باریک شبنم کے کرتے دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگتیں۔

یا جب سے وہ منتوں مرادوں سے ہار گئیں، چلے، بندھے اور ٹوٹکے اور راتوں کی وظیفہ خوانی بھی چت ہو گئی۔ لیکن پتھر میں جونک لگتی ہے۔

نواب صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر بیگم جان کا دل ٹوٹ گیا۔ اور وہ علم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ لیکن یہاں بھی کچھ نہ ملا۔ عشقیہ ناول اور جذباتی اشعار پڑھ پڑھ کر اور بھی پستی چھا گئی۔ رات کی نیند بھی ہاتھ سے گئی۔ اور بیگم جان جی جان چھوڑ کر بالکل ہی یاس و حسرت کی پوٹ بن گئیں۔

چولہے میں ڈالا تھا ایسا کپڑا، کپڑا پہنا جاتا ہے کسی پر رعب گانٹھنے کیلئے۔ جب نہ تو نواب صاحب کو فرصت کہ شبنمی کرتوں کو چھوڑ کر ذرا ادھر توجہ کریں اور نہ وہ انہیں کہیں آنے جانے دیتے جب سے بیگم جان بیاہ کر آئی تھیں۔ رشتہ دار آ کر مہینوں رہتے اور چلے جاتے مگر وہ بے چاری گھر میں ہی قید رہتیں۔

ان رشتہ داروں کو بھی دیکھ کر ان کا خون جلتا تھا۔ کہ سب کے سب مزے سے مال اڑانے عمدہ گھی نگلنے، جاڑے کا ساز و سامان بنوانے ان پر مرتے اور وہ باوجود نئی روئی کے لحاف کے پڑی سردی میں اکڑا کرتیں۔ ہر کروٹ پر لحاف نئی نئی صورتیں بنا کر دیوار پر سایہ ڈالتا۔ مگر کوئی بھی سایہ ایسا نہ تھا جو انہیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہو۔ مگر کیوں جیے پھر کوئی۔ ہ..... زندگی! بیگم جان کی زندگی جو تھی۔ جینا نصیبوں میں تھا، پھر وہ جینے لگیں اور خوب جئیں،

ربّو نے انہیں نیچے گرتے گرتے سنبھال لیا۔ چٹ پٹ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا سوکھا جسم بھرنا شروع ہو گیا۔ گال چمک اُٹھے اور حسن پھوٹ نکلا۔ ایک عجیب و غریب تیل سے نیم جان میں زندگی کی جھلک آئی۔ معاف کیجئے اس تیل کا نسخہ آپ کو بہترین سے بہترین رسالے میں بھی نہیں ملے گا۔

جب میں نے بیگم جان کو دیکھا تو وہ چالیس بیالیس کی ہوں گی اور کس شان سے مسند پر نیم دراز تھیں اور رَبّو ان کی پیٹھ سے لگی بیٹھی کمر دبا رہی تھی۔ ایک اُودھے رنگ کا دوشالہ ان کے پیروں میں پڑا تھا اور وہ مہارانی کی طرح شاندار معلوم ہو رہی تھیں۔ مجھے ان کی شکل بے حد پسند تھی۔ میرا جی چاہتا تھا۔ گھنٹوں بالکل پاس سے ان کی صورت دیکھا کروں۔ ان کی رنگت بالکل سفید تھی — نام کو سرخی کا ذکر نہیں اور بال سیاہ اور تیل میں ڈوبے رہتے تھے۔

میں نے آج تک ان کی مانگ بگڑی نہ دیکھی تھی کیا مجال جو ایک بال اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ ان کی آنکھیں کالی تھیں اور ابرو کے زائد بال علیحدہ کر دینے سے کمانیں سی کھچی ہوئی تھیں۔ آنکھیں ذرا اتنی ہوئی رہتی تھیں۔ بھاری بھاری پپوٹے ہوئے موٹی پلکیں سب سے زیادہ جو اُن کے چہرے پر حیرت انگیز، جاذب نظر چیز تھی وہ اُن کے ہونٹ تھے۔ عموماً وہ سرخی سے رنگے رہتے تھے اوپر کے ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں سی تھیں اور کن پٹیوں پر لمبے لمبے بال، کبھی کبھی ان کا چہرہ دیکھتے دیکھتے عجیب سا لگتا۔ کم عمر لڑکوں جیسا!

ان کے جسم کی جلد بھی سفید اور چکنی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے کس کر ٹانکے لگا دیئے ہوں۔ عموماً وہ اپنی پنڈلیاں کھجانے کے لئے کھولتیں تو میں چپکے چپکے ان کی چمک دیکھا کرتی۔ ان کا قد بہت لمبا تھا اور پھر گوشت ہونے کی وجہ سے بہت لمبی چوڑی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن بہت متناسب اور ڈھلا ہوا جسم تھا۔ بڑے بڑے چکنے اور سفید ہاتھ اور سڈول کمر، تو رَبّو ان کی کمر کھجایا کرتی تھی۔ یعنی گھنٹوں ان کی پیٹھ کھجاتی۔ پیٹھ کھجوانا بھی زندگی کی ضروریات میں سے تھا۔ بلکہ شاید ضروریاتِ زندگی سے زیادہ۔

رَبّو کو گھر کا کوئی اور کام نہ تھا۔ بس وہ سارے وقت ان کے چھپر کٹ پر چڑھی۔ کبھی پیر، کبھی سر اور کبھی جسم کے دوسرے حصّے دبایا کرتی تھی۔ کبھی تو میرا دل ابل اٹھتا تھا۔ جب دیکھو رَبّو

کچھ نہ کچھ دبا ہی رہی ہوتی یا مالش کر رہی ہوتی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں اپنی کہتی ہوں مجھے کوئی اتنا چھوئے بھی تو میرا جسم تو سٹرگل کے ختم ہو جائے۔

اور پھر روز روز کی مالش کافی نہیں تھی۔ جس روز بیگم جان نہاتیں۔ یا اللہ بس دو گھنٹے پہلے سے تیل اور خوشبودار اٹنوں کی مالش شروع ہو جاتی اور اتنی ہوتی کہ میرا تخیل سے ہی دل ٹوٹ جاتا۔ کمرے کے دروازے بند کر کے انگیٹھیاں سلگتیں اور چلتا مالش کا دور۔ عموماً ربو ہی اندر رہتی۔ باقی کی نوکرانیاں باہر سے ہی ضروریات کی چیزیں دیتی جاتیں۔

بات یہ تھی کہ بیگم جان کو کھجلی کا مرض تھا۔ بیماری کو ایسی کھجلی ہوتی کہ ہزاروں تیل اور اٹن ملے جاتے مگر کھجلی تھی کہ قائم۔ ڈاکٹر، حکیم کہتے، کچھ بھی نہیں جسم صاف چٹ پڑا ہے۔ ہاں اگر کوئی جلد کی بیماری ہو تو خیر۔ نہیں بھئی یہ ڈاکٹر تو موئے ہیں پاگل ..... کوئی آپ کے دشمنوں کو مرض ہے۔ اللہ رکھے خون کی گرمی ہے۔ رتو مسکرا کر کہتی اور مہین مہین نظروں سے بیگم جان کو گھورتی۔ اوہ یہ رتو۔ جتنی بیگم جان گوری تھیں اتنی یہ کالی۔ جتنی بیگم جان سفید تھیں۔ اتنی ہی یہ سرخ بس جیسے تپایا ہوا لوہا۔ ہلکے ہلکے چیچک کے داغ گٹھا ہوا ٹھوس جسم پھرتیلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ کسی ہوئی چھوٹی سی توند۔ بڑے بڑے پھولے

ہوئے ہونٹ جو ہمیشہ نمی میں ڈوبے رہتے اور جسم میں سے عجیب گھبرانے والی بو کے شرارے نکلتے رہتے تھے اور یہ ننھے ننھے پھولے ہوئے ہاتھ کس قدر پھرتیلے تھے ابھی کمر پر، تو وہ لیجئے پھسل کر کولہوں پر! وہاں سے رپٹے رانوں پر اور پھر دوڑے ٹخنوں کی طرف! میں تو جب کبھی بیگم جان کے پاس بیٹھتی یہی دیکھتی کہ اب اس کے ہاتھ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

گرمی جاڑے بیگم جان حیدرآبادی جالیدار کرتے پہنتیں گہرے رنگ کے پاجامے اور سفید جھاگ سے کرتے اور پنکھا بھی چلتا رہتا۔ پھر بھی وہ ہلکی دلائی ضرور جسم پر ڈھکے رہتی تھیں۔ انہیں جاڑا بہت پسند تھا۔ جاڑے میں مجھے ان کے یہاں اچھا معلوم ہوتا۔ وہ ہلتی جلتی بہت کم تھیں۔ قالین پر لیٹی ہیں پیٹھ کھجر رہی ہیں۔ خشک میوے چبائے جا رہی ہیں اور بس۔

ربو سے دوسری ساری نوکرانیاں خار کھاتی تھیں۔ چڑیل بیگم جان کے ساتھ کھاتی، ساتھ اٹھتی بیٹھتی، اور ماشاءاللہ ساتھ ہی سوتی تھی۔ ربو اور بیگم جان عام جلسوں اور مجموعوں کی دلچسپ گفتگو کا موضوع تھیں۔ جہاں ان دونوں کا ذکر آیا قہقہے اٹھے لوگ نہ جانے کیا کیا چٹکلے غریب پر اڑاتے مگر وہ دنیا میں کسی سے ملتی ہی نہ تھیں۔ وہاں تو بس وہ تھیں اور ان کی کھجلی۔

اس وقت میں کافی چھوٹی تھی اور بیگم جان پر فدا تھی۔ وہ

بھی مجھے بہت ہی پیار کرتی تھیں۔ سو جب اماں آگرے جانے لگیں تو میں بیگم جان کے ہاں آ گئی۔ میں بھی خوش۔ بیگم جان بھی خوش۔ آخر کو اماں کی بھابی بنی ہوئی تھیں۔ سوال یہ اٹھا کہ میں سوؤں کہاں؟ قدرتی طور پر بیگم جان کے کمرے میں۔ لہٰذا میرے لئے بھی ان کے چھپر کھٹ سے لگا کر چھوٹی سی پلنگڑی ڈال دی گئی۔ دس گیارہ بجے تک تو باتیں کرتے رہے۔ پھر میں سونے کیلئے اپنے پلنگ پر چلی گئی اور جب میں سوئی تو ربو ویسی ہی بیٹھی ان کی پیٹھ کھجا رہی تھی۔ "بھنگن کہیں کی" میں نے سوچا ...... رات کو میری ایک دم آنکھ کھلی تو مجھے عجیب طرح کا ڈر لگنے لگا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا اور اس اندھیرے میں بیگم جان کا لحاف ایسے ہل رہا تھا۔ جیسے اس میں ہاتھی بند ہو۔ بیگم جان میں نے ڈری ہوئی آواز نکالی۔ ہاتھی ہلنا بند ہو گیا۔ لحاف نیچے دب گیا۔

"کیا ہے ...... ؟ سو رہو ..... بیگم جان نے کہیں دور سے آواز دی۔"

"ڈر لگ رہا ہے ....." میں نے چوہے کی آواز سے کہا۔

"سو جاؤ ..... ڈر کی کیا بات ہے۔ آیت الکرسی پڑھ لو۔"

اچھا ..... میں نے جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھی۔

مگر یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ .... پر ہر دفعہ اٹک گئی۔ حالانکہ مجھے اس وقت پوری آیت الکرسی یاد تھی۔

تمہارے پاس آجاؤں۔ بیگم جان .... ؟

نہیں بیٹی .... سو رہو .... ذرا سختی سے کہا۔
اور پھر دو آدمیوں کے کھسر پھسر کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔

.... ہائے رے یہ دوسرا کون ؟ میں اور بھی ڈری۔
بیگم جان .... چور وور تو نہیں ....
سو جاؤ بیٹا .... کیسا چور۔ ربو کی آواز سنائی دی۔
میں جلدی سے لحاف میں منہ ڈال کر سوگئی۔
صبح میرے ذہن میں رات کے خوفناک نظارے کا خیال بھی نہ رہا۔

میں ہمیشہ کی وہمی ہوں۔ رات کو ڈرنا، اٹھ اٹھ کر بھاگنا۔ اور بڑبڑانا تو بچپن میں روز ہی ہوتا تھا۔ سب تو کہتے تھے مجھ پر بھوتوں کا سایہ ہوگیا ہے۔ لہٰذا مجھے خیال بھی نہ رہا۔ صبح کو لحاف بالکل معصوم نظر آنے لگا تھا۔ مگر دوسری رات میری آنکھ کھلی تو ربو اور بیگم جان میں کچھ جھگڑا بڑی خاموشی سے چھپر کھٹ پر طے ہو رہا تھا۔ اور میری خاک سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کیا فیصلہ ہوا۔ ربو ہچکیاں لے کر روئی۔ پھر بلی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے کی آوازیں آنے لگیں اونھ میں تو گھبرا کر سوگئی۔
آج تو ربو اپنے بیٹے سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ بڑا ...

جھنجھلاتی تھا بہت کچھ بیگم جان نے دکان کرائی گاؤں میں لگایا۔ مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ نواب صاحب سے یہاں کچھ دن رہا۔ خوب جوڑے بالگے بھی بنے پر نہ جانے کیوں ایسا بھاگا کہ ربو سے ملنے بھی نہ آتا .... لہذا ربو ہی اپنے ان رشتہ دار کے یہاں اس سے ملنے گئی تھی۔ بیگم جان جانے تو دے رہی تھیں مگر ربو بھی مارے ممتا کے مجبور ہو گئی تھی۔

سارا دن بیگم جان پریشان رہیں۔ ان کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا رہا۔ کسی کا چھونا انہیں نہ بھاتا۔ انہوں نے کھانا بھی نہ کھایا کہ سارا دن اداس پڑی رہیں۔

میں کھجا دوں بیگم جان ..... میں نے بڑے شوق سے تاش کے پتے بانٹتے ہوئے کہا۔ بیگم جان مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔

میں کھجا دوں ..... سچ کہتی ہوں .... میں نے تاش رکھ دیئے۔

میں تھوڑی دیر تک کھجاتی رہی اور بیگم جان چپکی لیٹی رہیں دوسرے دن ربو کو آنا تھا مگر وہ نہ آئی۔ بیگم جان کا مزاج چڑچڑا ہوتا گیا... چائے پی پی کر انہوں نے سر میں درد کر لیا۔

میں پھر کھجانے لگی ان کی پیٹھ ...... چکنی میز کی تختی جیسی پیٹھ۔ میں ہولے ہولے کھجاتی رہی ان کا کام کر کے کیسی خوشی

ہوتی تھی۔

ذرا زور سے کھجاؤ ..... بند کھول دو .... بیگم جان بولیں۔ ادھر ..... اے ہے ذرا شانے سے نیچے ... ہاں واہ بھئی واہ .... ہا .... ہا ... " وہ سرور میں ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لیکر اطمینان کا اظہار کرنے لگیں۔

اور ادھر حالانکہ بیگم جان کا ہاتھ خوب جا سکتا تھا۔ مگر وہ مجھ سے ہی کھجوا رہی تھیں اور مجھے الٹا فخر ہو رہا تھا۔ "یہاں ... اوئی .... تم گدگدی کرتی ہو .... واہ .... وہ ہنسیں۔ میں باتیں بھی کر رہی تھی اور کھجا بھی رہی تھی۔

" تمہیں کل بازار بھیجوں گی .... کیا لوگی۔ وہی سوتی جاگتی گڑیا۔"

نہیں بیگم جان .... میں تو گڑیا نہیں لیتی۔ کیا بچہ ہوں اب میں۔"

بچہ نہیں تو کیا بوڑھی ہو گئی ..... وہ ہنسیں .... گڑیا نہیں تو ببوا لینا .... کپڑے پہنانا خود .... میں دوں گی تمہیں بہت سے کپڑے .... سنا .... انہوں نے کروٹ لی۔

اچھا۔ میں نے جواب دیا۔

ادھر ..... انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر جہاں انہیں کھجلی ہوتی وہاں میرا ہاتھ رکھ دیتیں۔ اور بے خیالی میں ببوے کے خیال

میں ڈوبی مشین کی طرح کھجاتی رہی اور وہ متواتر باتیں کرتی رہیں۔
سنو تو ..... تمہاری فراکیں کم ہو گئیں ہیں۔ کل درزی کو دے دونگی کہ نئی سی لائے۔ تمہاری اماں کپڑا دے گئی تھی۔ وہ لال کپڑے کی نہیں بنواؤں گی .... چماروں جیسا ہے۔
میں بکواس کر رہی تھی اور ہاتھ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا۔ باتوں باتوں میں معلوم بھی نہ ہوا۔ بیگم جان چت لیٹی تھیں۔ اسے میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔
ادئی لڑکی .... دیکھ کر نہیں کھجاتی۔ میری پسلیاں نوچے ڈالتی ہے۔ بیگم جان شرارت سے مسکرا ہیں اور میں جھینپ گئی۔
ادھر آ! میرے پاس آکر لیٹ جا .....
انہوں نے مجھے بازو پر سر رکھ کر لٹا لیا۔
"اے ہے کتنی سوکھ رہی ہے..... پسلیاں نکل رہی ہیں"
انہوں نے میری پسلیاں گننی شروع کر دیں۔
اُوں ..... تو میں کیا کھا جاؤں گی ..... کتنا تنگ سوئیٹر بنا ہے۔
گرم بنیان بھی نہیں پہنی تم نے ....."
میں کلبلانے لگی۔
کتنی پسلیاں ہوتی ہیں انہوں نے بات بدلی۔
"ایک طرف نو اور ایک طرف دس۔"

میں نے اسکول میں یاد کی ہوئی ہائی جین کی مدد لی وہ بھی اوٹ پٹانگ۔

ہٹاؤ تو ہاتھ ...... ہاں، ایک، دو ... تین ...."

میرا دل چاہا۔ کسی طرف بھاگوں اور انہوں نے زور سے بھینچا ....

"اوں ..... "میں مچل گئی۔

بیگم جان زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اب بھی جب کبھی میں ان کا اس وقت کا چہرہ یاد کرتی ہوں۔ تو دل گھبرانے لگتا ہے۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے اور وزنی ہو گئے۔ اوپر کے ہونٹ پر سیاہی گری ہوئی تھی۔ باوجود سردی کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ہونٹوں اور ناک پر چمک رہی تھیں ان کے ہاتھ ٹھنڈے یخ تھے۔ مگر گرم نرم جیسے ان پر کھال اتر گئی ہو۔ انہوں نے شال اتار دی تھی اور کارگے کے مہین کرتے میں ان کا جسم آٹے کی لوئی کی طرح چمک رہا تھا۔ بھاری جڑاؤ سونے کے بٹن گریبان کے ایک طرف جھول رہے تھے۔ شام ہو گئی تھی اور کمرہ میں اندھیرا گھٹ رہا تھا۔ مجھے ایک نامعلوم ڈر سے وحشت سی ہونے لگی۔ بیگم جان کی گہری گہری آنکھیں۔ میں رونے لگی دل میں۔ وہ مجھے ایک مٹی کے کھلونے کی طرح بھینچ رہی تھیں۔ ان کے گرم گرم جسم سے میرا دل ہولانے لگا۔ مگر ان پر تو جیسے کوئی بھوتنا سوار تھا۔ اور میرے

دماغ کا یہ حال کہ نہ چیخا جائے اور نہ رو سکوں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پست ہو کر نڈھال لیٹ گئیں ان کا چہرہ پھیکا اور بد رونق ہو گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔ میں سمجھی اب مریں یہ، اور وہاں سے اٹھ کر سرپٹ بھاگی باہر....

شکر ہے کہ ربو رات کو آ گئی اور میں ڈری ہوئی جلدی سے لحاف اوڑھ کر سو گئی۔ مگر نیند کہاں چپ گھنٹوں پڑی رہی۔

اماں کسی طرح آہی نہیں چکی تھیں بیگم جان سے مجھے ایسا ڈر لگتا تھا کہ میں سارا دن ماماؤں کے پاس بیٹھی رہتی۔ مگر ان کے کمرے میں قدم رکھتے دم نکلتا تھا اور کہتی بھی کس سے اور کہتی ہی کیا کہ بیگم جان سے ڈر لگتا ہے؟ توبہ بیگم جان جو میرے اوپر جان چھڑکتی تھیں۔

آج ربو اور بیگم جان میں پھر ان بن ہو گئی.... میری قسمت کی خرابی کہئے یا کچھ اور۔ مجھے ان دونوں کی ان بن سے ڈر لگا۔ کیونکہ فوراً ہی بیگم جان کو خیال آیا کہ میں باہر سردی میں گھوم رہی ہوں اور مروں گی نمونیہ میں۔"

لڑکی کیا میرا سر منڈوائے گی۔ جو کچھ ہو گیا تو اور آفت آئے گی۔ انہوں نے مجھے پاس بٹھالیا وہ خود منہ ہاتھ سلفچی میں دھو رہی تھیں۔ چائے تپائی پر رکھی تھی۔

چائے تو بناؤ، ایک پیالی مجھے بھی دینا۔ وہ تولیہ سے

سرخشک۔ کر کے بولیں۔ میں ذرا کپڑے تبدیل کر لوں۔

وہ کپڑے بدلتی رہیں اور میں چائے پیتی رہی۔ بیگم جان نائن سے پیٹھ ملواتے وقت اگر مجھے کسی سے بلاتیں تو ہیں گردن موڑے موڑنے جاتی اور واپس بھاگ آتی۔ اب جو انہوں نے کپڑے بدلنے شروع کئے تو میرا دل اُلٹنے لگا۔ منہ موڑے چائے پیتی رہی۔

ہائے اماں ..... میرے دل نے بیکسی سے پکارا۔

آخر ایسا میں بھائیوں سے کیا لڑتی ہوں جو تم میری مصیبت ..... اماں کو ہمیشہ میرا لڑکوں سے کھیلنا ناپسند تھا۔ بھلا کہو لڑکے کیا شیر چیتے ہیں جو نگل جائیں گے ان کی لاڈلی کو۔ لڑکے بھی کون؟ خود بھائی اور دو چار سڑے سڑائے ذرا ذرا سے ان کے دوست ..... مگر نہیں وہ تو عورت ذات کو سات پردوں میں رکھنے کی قائل۔ اور یہاں بیگم جان کی وہ دہشت کہ دنیا بھر کے غنڈوں سے نہیں۔ بس چلتا تو اسی وقت سڑک پر بھاگ جاتی پر وہاں نہ ٹکتی۔ مگر لاچار تھی۔ مجبوراً کلیجہ پر پتھر رکھے بیٹھی رہی۔

کپڑے بدل کر سولہ سنگھار ہوئے اور گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی انگارہ کر دیا۔ اور وہ چلیں مجھ پر لاڈ اتارنے

گھر جاؤں گی میں نے ان کی ہر رائے کے جواب میں کہ اور رونے لگی۔ میرے پاس تو آؤ میں ..... تمہیں بازار لے چلوں ..... سنو تو ..... مگر میں کھلی کی طرح پھیلتی چلی گئی

سارے کھلونے، مٹھائیاں ایک طرف اور گھر جانے کی رٹ ایک طرف
وہاں بھیا ماریں گے..... چڑیل" انہوں نے پیار سے تھپڑ لگایا
"کچی امبیاں کھٹی ہوتی ہیں بیگم جان!" جلی کٹی ربو نے رائے دی۔
اور پھر اس کے بعد بیگم جان کو دورہ پڑ گیا۔ سونے کا وہ ہار جو تھوڑی دیر
پہلے مجھے پہنا رہی تھیں۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مہین جالی کا دوپٹہ تار
تار۔ اور وہ مانگ جو میں نے پہلے کبھی بگڑی نہ دیکھی تھی جھاڑ جھنکار ہو گئی
اوہ.... اوہ.... اوہ.... اوہ، وہ جھٹکے لے کر چلانے لگیں

میں رپٹی باہر۔

بڑے جتنوں سے بیگم جان کو ہوش آیا۔ جب میں سونے
کیلئے کمرے میں دبے پیر جا کر جھانکی تو ربو ان کی کمر سے لگی جسم دبا رہی
تھی —

جوتی اتار دو.... اس نے ان کی پسلیاں کھجاتے ہوئے کہا
اور میں چڑیا کی طرح لحاف میں دبک گئی۔
سر سر پھٹ پچ...... بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں
ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔"
اللہ۔ آں.... میں نے مری ہوئی آواز نکالی۔ لحاف میں
سے ہاتھی پھدکا اور بیٹھ گیا۔ میں بھی چپ ہو گئی۔ ہاتھی نے پھر لوٹ
مچائی۔ میرا رواں رواں کانپا..... آج میں نے دل میں ٹھان لیا
کہ ہمت کر کے سرہانے کا بلب ضرور جلا دوں گی۔ ہاتھی پھر پھڑپھڑا رہا

اور جیسے اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چپڑ چپڑ کچھ کھانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی مزیدار چٹنی چکھ رہا ہو۔ اب میں سمجھی! یہ بیگم جان نے آج کچھ نہ کھایا تھا اور یہ ربڑ مردی تو ہے ہی سدا کی چٹو۔ ضرور یہ ترمال اڑا رہی ہے۔ میں نے نتھنے پھلا کر سوں سوں ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر اور صندل اور حنائی گرم گرم خوشبو کے اور کچھ محسوس نہ ہوا۔ لحاف پھر امنڈنا شروع ہوا۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ چپکی پڑی رہوں مگر اس لحاف نے تو ایسی ایسی عجیب شکلیں بنانی شروع کیں کہ میں لرز گئی۔ معلوم ہوتا تھا غوں غوں کر کے کوئی بڑا سا مینڈک پھول رہا ہے اور اب اچھل کر میرے اوپر آیا۔

آ.....ں..... اماں۔ میں ہمت کر کے گنگنائی۔ مگر وہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی اور لحاف میرے دماغ میں گھس کر پھولنا شروع ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پلنگ کے دوسری طرف پیر اتارے اور ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا۔ ہاتھی نے لحاف کے نیچے قلابازی لگائی اور چھپک گیا۔ قلابازی لگانے میں لحاف کا کونا فٹ بھر اٹھا..... اللہ۔ میں غڑپ سے اپنے بچھونے میں ○○

تیسرا دورہ

جب پہلی بار مولوی رفاقت کو مرگی کا دورہ پڑا تو مولویائین کے ہاتھو
کے طوطے اُڑ گئے۔ ویسے ہی پاؤں چادر سے باہر نکل رہے تھے کھانیوالے
پانچ کمانیوالے ٹٹرلوں ایک! اے مولی کیسے یہ ٹبر سمٹیا جائیگا۔ ان مسٹنڈوں
کی نیا آکیونکر پار لگے گی اب تو پاکستان میں بھی تالے پڑ گئے ایک سے
زیادہ عورت کرنے پر پابندی لگ گئی۔ سراسر کفر ہوا کہ نہیں دو باجو وہاں
جاتے تھے سو بھی ہاتھ سے گئے۔

پہلا دورہ مولوی صاحب کو اپنی دلہنیا کی [illegible]
پر لوگ ٹنڈے کے تنور پہ چیٹے [illegible]

رہے تھے۔ مولوی صاحب کے اکڑے ہوتے ہاتھ پیر اور منہ سے ابلتے
ہوئے جھاگ دیکھ کر لوگوں کا کلیجہ یا پیا حلق کے بیرون اچھلنے لگا۔ شبیر سقہ دوڑا اور
اسے دیکھ کر دھاڑا اور بستر پہ دوڑ پڑے بھیانک منظر بڑا دلچسپ ثابت
ہوتا ہے اعصاب جھرجھراتے ہوں۔

کہیں خون خچر ہو، کوئی گاڑی کے نیچے آجائے کسی کا بھیجا
پھٹ جائے آنتیں نکل پڑیں لوگ سارا کام کاج چھوڑ کے دوڑ پڑتے ہیں
مولوی صاحب کی گھومی ہوئی آنکھیں باہر کو لٹکی ہوئی زبان اور پھڑکتا ہوا
سوکھا مارا ڈھانچہ دیکھنے کو لوگ اُبل پڑے جب ذرا تناؤ ڈھیلا پڑنے لگا
تو حاضرین نے شبیر سقہ کی کاندھوں میں انہیں ڈیوڑھی میں لے جا کے دھر دیا۔

مولویائن کھڑی پڑی پچھاڑیں کھا رہی تھیں "ہائے بندی کو
کس پہ چھوڑ چلے۔" انہوں نے مولوی صاحب کے قریب زمین پر دو ہتڑ
مار کر کہا۔ مگر تب ہی مولوی صاحب نے ایک جھرجھری لی اور کراہنے لگے

نظارے سے محروم رہنے والوں نے کئی ہفتے تک جن کے دورے
کی تفصیل سنی اور اس دن سارے محلہ میں سوائے مولوی صاحب کے
دورے کے اور کوئی نکتہ اہمیت نہ حاصل کر سکا لوگ مزید تفصیل سنتے
اور خود اپنی آنکھوں سے دورہ زدہ مولوی صاحب کو دیکھنے آتے رہے
مولویائن نے پلنگ پہ جا نماز ڈال دی اور وہ مٹکے پانی پھیر دیا۔

لوگ سہمی ہوئی نیچی آواز میں تفصیل سنکر نسخے تجویز کرتے رہے جو نا بعلگو کر نگی سے لیکر پھوڑی کے آپریشن تک پر بحث ہو گئی۔ مخالفین اور موافقین کے دو گروہوں میں ناچاقیاں بڑھتے بڑھتے بچیں۔

بات شاید اتنی اہمیت نہ پکڑتی۔ اگر بچن صاحب مولوی صاحب کی خیریت پوچھنے نہ آجاتے۔ بچن صاحب گڈس کلرک تھے اب چند سال سے ریٹائر ہو کر کچھ قوم کی خدمت کیطرف راغب ہو رہے تھے سلیف میڈ آدمی تھے۔ اتنی معمولی نوکری میں بھی انہوں نے نہایت جانفشانی سے معقول جائیداد بنالی تھی۔ اور جلد ہی لاہور کشن روڈ پر نئی کوٹھی کی تعمیر کے بعد اپر کلاس میں منتقل ہونیوالے تھے۔ انہیں مولوی صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔

ایک دفعہ نہ جانے کس دشمن نے لگائی بجھائی کر دی تھی۔ لاکھ کھلایا پلایا مگر بات نہ بنی تب مولوی صاحب کی کرامت سے کچھ ایسا خدا کا کرنا ہوا کہ ٹرانسفر کی مصیبت سے بھی بچ گئے اور دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑی الٹے بچن صاحب کی ترقی ہو گئی۔

ویسے سارے محلے ہی کو مولوی صاحب کی مقدس ہستی کا سہارا تھا۔ مگر مہنگائی اور بے روزگاری نے معتقدین کو مفلوج کر رکھا تھا۔ بچن صاحب لوگوں کے اصرار سے میونسپل الیکشن میں کھڑے

ہونے والے تھے غریب مفلس محلے والوں کے دکھ درد میں اس نیت سے شریک ہوتے کہ اخبار وں تک ان کا ذکر نکل جاتا جب وہ مولوی صاحب کی خیریت پوچھنے آئے تو ان کا ولایت جانے والا لڑکا ان کے ساتھ آیا۔

نوادر خدیجہ چاپ کے پیچھے سے پیٹر پیٹر اکے رہ گئیں شفیق میاں سارے محلہ کی لڑکیوں کے گلفام تھے گھنٹوں لڑکیاں سر جوڑ کے ان کے عشق کے تصور پر میٹھی میٹھی باتیں کرتیں آج کل کون سی لڑکی انہیں پرچے بھیج رہی ہے کس کی کھڑکی پر وہ رات کو کنکریاں پھینکتے ہیں۔ مہترانی کو رافیہ نے پیغام رسانی کے انعام میں نیا منگل باڑی کا دوپٹہ دیدیا۔ منہارن نئی سلیپریں پہنے کارتی پھرتی ہیں۔ جو پچھلی بقرعید پر شاکرہ نے دو گھڑی کیلئے پیر میں ڈالی تھیں۔ نئی کی نئی دے دیں۔ شفیق میاں بمبئی تک ہو آئے تھے اور فلمی ہیرو بنتے بنتے بچے تھے جب ٹیری لین کا ہی رنگ کی پتلون پہن کر چلتے تھے تو رگ پٹھے تڑپتے نظر آتے تھے ہپی فیشن کے کنگھی بال جب وہ چوک سے گزرتے ہوئے جھٹکتے تھے تو فضا کنواری آہوں کے بوجھ سے لرز اٹھتی تھی۔

بچن صاحب کے آنے سے مولوی صاحب کے

دورے کی قیمت ایک دم بڑھ گئی۔ آتے ہی انہوں نے احکام جاری کرنے شروع کر دیئے۔ فوراً ہسپتال فون کر کے مولوی صاحب کیلئے خاص مریضوں کا بیڈ منگوایا جس کا پینچ گھما کر سرہانہ اونچا نیچا کیا جا سکتا تھا۔ ایمرجنسی کے خیال سے ایک سلنڈر آکسیجن بھی آ گیا جسے دیکھ کر مولویائین کی روح لرز اٹھی۔

اتنے بھیانک بم کی شکل کے سلنڈر کو دیکھ کر انہیں اپنے
کے وارد ہونے میں قطعی شک نہ رہا۔ مگر انہوں نے اس
کے خلاف فوراً محاذ قائم کر لیا۔ حشر ہو جائے یہ بم نگوڑا نہیں
گی۔ بچے باپ کو حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ کب ابا پر ایمرجنسی طاری ہو اور بم چلے۔

اچھی بھلی عمر والیاں نت نئے بہانے کر کے بم کو دیکھنے آ رہی تھیں اس بم کی تفصیل اور میونسپلٹی کی غریب پروری کی تعریفیں اخباروں میں نکلیں جس ملک میں ایک معمولی کنگال مولوی کی یہ دیکھ ریکھ ہوتی ہو اسکی جمہوریت میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے؟

سڑکوں پر غلاظت سڑ رہی ہے ہسپتالوں میں اندھا دھند ہو رہی ہے، سب جھوٹ، لوگ خواہ مخواہ الزام تراشتے ہیں بھلا ایسے دل والے خدا ترس لوگ رشوت خوری اور غبن جیسی مکروہ حرکتیں

کر سکتے ہیں۔

اور بچن صاحب جیسا نیک اور بے غرض انسان دنیا کے پردے پر آسانی سے نہیں ملے گا۔ پلنگ اور سلنڈر کے بعد بھی انہیں اطمینان نہ ہوا۔ جس جگہ مولوی صاحب رہتے تھے اسے مکان کا الزام دینا قطعی زیادتی تھی۔ ٹیڑا کبڑا اڈھیتا ہوا ایک ڈربہ سا تھا جس میں شاید مرغا بھی رکھا جاتا ہوتا تو وہ بھی احتجاج کرتیں ہفتہ بھر کے اندر ایک نسبتاً صاف ستھرا مکان مل گیا۔

مولویائن نے گودڑ کے گٹھر باندھنے ناکارہ ہنڈیاں پٹارے پیڑھیاں جھلنگے سمیٹے لیکن بیگم بچن نے انہیں رائے دی کہ یہ کباڑ مریض کیلئے بالکل ضروری نہیں، سب جلا دینے کے قابل ہے کل تک جو چیزیں مزے سے برت رہی تھیں انہیں جلا دینے کے تصور سے مولویائن کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ انھوں نے سارا کباڑ باندھ بوندھ کر شبیر سقے کی مٹی پر ڈلوادیا۔ اللہ جانے کب کس شے کی ضرورت لاحق ہو جائے۔

دوسرا دورہ مولوی صاحب کو علین ایلن آباد کے چوراہے پر پڑا اور اتنا ڈرامائی حادثہ ثابت ہوا کہ سارا شہر ہل گیا۔ بچن صاحب الیکشن میں پھنسے ہوئے تھے مگر پھر بھی انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے فوراً مولوی رحمت کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں شہر کے روساء سرمایہ دار اور کئی ممبران پارلیمنٹ بھی چنے گئے۔ شبیر سقہ نے آخری لفظ اپنے نام سے ہٹا کر۔

محمد فاروقی جوڑلیا۔ وہ مولوی صاحب کے انتھک معتقدین میں اول نمبر تھا۔
زراثانی تہمد اور بنڈی چھوڑکر کھدر کا کرتا پاجامہ اور جواہر کٹ واسکٹ بنوائی
و جلد ہی ٹرلین کی پینٹ اور ریڑی کی لش شرٹ میں تبدیل ہوگئی اب انہیں
دئی لفظ سقہ سے وابستہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اب تو نل گھر گھر
پہنچ رہے ہیں

دوسرے دورے کے بعد مولوی صاحب لاٹوش روڈ پر بحین صاحب
کی نئی کوٹھی کے قریب منتقل ہو گئے اس برس میں صفائی کو خاص اہمیت حاصل
ہے اب وہ انٹرنیشنل تو نہیں مگر نیشنل ضرور بن گئے تھے لوگوں میں سخت
چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ آخر اب تک انھیں "پدم شری" کا خطاب کیوں نہیں
ملا ہے ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو بٹ رہا ہے مولوی صاحب کو کیوں
نظر انداز کیا گیا۔ یہ اقلیت کے ساتھ کھلی ناانصافی ہے۔ ایک روشن خیال
جمہوری سرکار کو یہ تفریق نہیں کرنا چاہیے۔ مولوی رفاقت کمیٹی نے اپنے
سالانہ جلسے میں اس نکتہ پر سنجیدگی سے غور کیا۔

٭ ٭ ٭

انسان موت سے خائف ہے وہ جو مر چکے ہیں یا قریب المرگ
ہیں۔ یقیناً ہٹے کٹے زندہ انسانوں سے زیادہ قابل توجہ ہیں۔ بڑے

بڑے پہونچے ہوئے لوگ زندہ تھے تو نہ جانے کہاں رُلتے رہتے اگر مرتے نہ تو ان کے مزار کیونکر بنتے۔ اور لوگ ان کے حضور میں گلہائے عقیدت کیسے پیش کرتے۔

مولوی صاحب موت کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے لوگ ان سے سخت مرعوب تھے ان کی نیک طینتی سے ہر شخص کو اُمید تھی کہ وہ دعائیں جو اِدھر اُدھر دفتروں کی عرضیوں کیطرح کھٹائی میں پڑجاتی ہیں ان کے وسیلے سے خدائے برتر کے حضور تک بحفاظت پہنچ جائیں گی۔ بالکل جیسے ایک ہوشیار ہیڈ کلرک دم بھر میں فائل تلاش کرکے کاغذات حکام بالا تک پہنچا دیتا ہے ویسے ہی ایک نیک اور بھلا آدمی عاقبت سنوارنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے شرط ہے کہ اسے خوش کردیا جائے۔

لوگ مولوی صاحب کو بھی خوش کرنے پر مُصر تھے۔ اب ان کی پوزیشن کافی بلند ہوگئی تھی۔ بڑے بڑے سرکاری اسپتالوں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ مولوی رفاقت مدعو نہ ہوں تو ان کے معتقدین اسے اپنی ذاتی ہتک اور حلق تلفی سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب اقلیتی طبقے کے نمائندے تھے ان کی زندگی میں پورے طبقہ کا عکس نظر آتا تھا۔ جب لوگوں نے مولویائین کو پردہ چھوڑنے کی رائے دی تو وہ پچھاڑ کھا گئیں حشر میں کیا منہ لے کے جائیں

پھر لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ حشر ابھی کافی دور ہے اس کا کیا ٹھکانہ
ن سر پر آرہے ہیں بچن صاحب اور رفاقت کمیٹی نے اس سال
ت شاندار طریقے پر رفاقت ڈے منانے کا فیصلہ کیا ہے جلسے
ہرے ہوں گے قوالی کا پروگرام بھی ہے۔ منّن چلے بضد تھے کہ ملکۂ
شکیلہ بانو بھوپالی کو بلایا جائے۔ اگر کوئی فلم اسٹار آجائے تو ٹکٹ بڑی
نی سے بکیں گے شفیق میاں کئی بار بمبئی جا چکے ہیں اور فلم اسٹار بنتے
بچے ہیں۔ وہ ضرور دلیپ کمار، مینا کماری کو رضامند کر لائیں گے۔
نو دارے نیارے ہو جائیں گے۔

مولویائن کو چیف منسٹر کو ہار پہنانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ برقعے میں
پہناتے ہوئے تصویر کیسے کھنچے گی۔ ساڑھی پہن کر چلنے پھرنے کی
ت نہ تھی۔ یہی لگتا تھا کہ موئی اب گری کہ تب گری۔ لاکھ کس کے
رتو، ہے تو خلا کی مانند، بے ٹھکانے، ملعونوں کا پہناوا۔ اسی ساڑھی
مذمت میں کسی زمانے میں مولوی رفاقت نے وعظ فرمائے تھے
بھی سے مولویائن کے دل میں دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس منحوس
پاس میں نماز نہیں ہوتی سو الگ۔

مگر جب سے لالوکش روڈ کی کوٹھی میں آئے تھے زیادہ
روزے نماز کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا آس پاس کی کوٹھیوں سے زیادہ

تو ریڈیو پر فلمی گیت ہی سنائی دیتے تھے اور لڑکیاں بالیاں بھی اب "تیری ذات پاک ہے اے خدا" کے بجائے بند یا چمکے گی چوڑی چھنکے گی" ہی گنگنانے لگتی تھیں۔

دو دوروں ہی میں مولوی صاحب کی صورت نکھر آئی تھی گورا چٹا رنگ جو مفلسی میں جھلس گیا تھا ایک دم مبدا شہاب ہو گیا۔ مولویائن نے بھی لوگوں کے کہنے سننے سے مجبور ہو کر خضاب شروع کر دیا اور پہلے سے زیادہ کمسن نظر آنے لگی تھیں اب انہیں چوکنا رہنے کی بھی ضرورت تھی پہلے مولوی کی جوانی میں کسی لونڈیا نے انہیں پلٹ کر نہ دیکھا۔ مگر جب سے ان کا روپ رنگ نکھرا تھا۔ پوزیشن بڑھی تھی۔ اچھے بھلے خاندانوں کی بہو بیٹیاں ان سے ہنسنے بولنے میں فخر سمجھنے لگی تھیں۔

مولویائن کا کھچڑی چونڈا خطرے کا سگنل تھا۔ وہ اب ہر دم ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کی ہر دم موجودگی سے مولوی صاحب کا مرض زیاد مہنگ ظاہر ہوتا تھا۔ لوگ جب ان کی سہمی سی اداس شکل دیکھتے تو ان کے دل جذبہ رحم سے امنڈنے لگتے کسی وقت بھی بیوگی کا آسیب غریب عورت کا سہاگ اجاڑ سکتا ہے۔ اور پھر بہت سے مراعات جو مولوی صاحب کے منہ سے چھچھوندری معلوم ہوتیں۔ بیگم جب ان کیلئے جھگڑتیں تو انہیں ایک طرح کا تقدس نظر آنے لگتا۔ ان کے لئے اسپیشل سواری

نرم گدے والی کرسی، نہایت الگ قسم کا پرہیزی کھانا، مولوی صاحب طبی نقطۂ نظر سے کچھ خون کے دباؤ کی کمی کے خیال سے دو چار گھونٹ پینے لگے تھے صحبتیں ہی اب ایسی سوسائٹی میں ہونے لگی تھیں اور مولوی صاحب کی ضد پر مولویانی بھی ہونٹ جھٹال لیتی تھیں۔ عام جلسوں میں جملہ دواؤں کے ساتھ فلاسک بھی رکھتی تھیں۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مولوی صاحب بہت تھکے ہونے ہوتے کہ اب انھیں ان گنت پبلک فنکشن اٹینڈ کرنا پڑتے تھے ظاہر ہے وہ ہر جگہ نہیں جا سکتے تھے تو وہاں لوگ ہاتھ پیر جوڑ کر مولویانی کو لے جاتے اور زنانہ جلسوں میں تو وہ لازمی طور پر یا تو صدر چنی جاتیں یا مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈائس پر بیٹھتیں۔ چیف گیسٹ کو ہار پہنانے کا اہم کام انجام دیتیں پھر انہیں ہار پھول سے لاد دیا جاتا۔

مولویانی کی شوہر سے الگ ایک پوزیشن بن گئی تھی۔ روز کوئی نہ کوئی قصہ جان کو لگا رہتا۔ آج کسی اسکول میں تقسیم انعامات کیلئے جانا، کل کوئی زنانہ اسٹور کا اوگھاٹن کرنا ہے۔

مولوی صاحب کے حلقہ میں بہت سے نو دولتئے لگ گئے جن کے پاس دولت تو ہے شہرت کی تمنا ہے وہ مولوی صاحب کا نام لے کر بڑے بڑے قومی کارنامے انجام دینے لگے۔ قومی خدمت کا

بھی دروازہ تنگ ہوتا جارہا ہے آپ مزدور کسان کا کچھ ذکر نہیں کرتے
کیونکہ اس طرح سیاسی ٹھپہ پڑنے کا اندیشہ ہے بعض اوقات تو
گورنمنٹ پر حملے کا الزام آتا ہے۔ جس میں قطعی خیریت نظر نہیں آتی
دیکھئے ایک پاک صاف اور محفوظ ترین موضوع اردو کی بقا کیلئے جدوجہد
کرنے کا رہ گیا ہے۔

بڑی خوشی سے اردو کی بقا کیلئے ڈنر اور پارٹیاں کر سکتے ہیں
بھی اس معاملے میں آپ کا ساتھ دے گی۔ بڑے منسٹر تشریف
جدوجہد کی رو کو تیز کرنے میں مدد کرنے کو تیار ہیں۔ تصویریں کھنچواتے
اخباروں میں جلی حروف کیساتھ چھپیں گی اور کل تک جو پڑوسی آپ کو تیسرے
درجہ کا اسمگلر سمجھ کر کڑکڑاتے تھے ہکا بکا رہ جائیں گے اور بہت جلد
ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے مختلف اداروں میں دخل انداز ہو

مولوی صاحب اردو فارسی اور عربی کے عالم کی حیثیت سے
عمر ٹھوکریں کھاتے رہے مگر دوسرے دورے کے بعد اردو کی حمایت
میں سر کی بازیاں لگانے والوں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہوگیا۔ ان کی
میں کتنی ہی اردو کمیٹیاں اور اردو سرکل قائم ہوتے اور رفتہ رفتہ ساکھ
اوّل درجہ کے ریستورانوں میں ڈنر پارٹیوں کی صورت اردو کی رکھشا
شروع ہوگئی۔ چونکہ مولوی صاحب اردو کے سب سے بڑے

مان لئے گئے تھے مسز مولوی تدریجی طور حمایتی ہو گئیں کچھ یونہی سی شد بد تھی مگر جب اردو کی حمایت میں اخباروں میں ان کے زریں خیالات نکلتے تو لوگ عش عش کر اٹھتے۔

پارٹیوں کی ٹوٹ پھوٹ کے سلسلہ میں مولوی صاحب کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ ہر شاخ اسی کوشش میں لگ گئی کہ کسی ترکیب سے مولوی صاحب کو ہتھیالیا جائے۔

مگر بچن کی گرفت مولوی صاحب پر بہت سخت تھی وہ بھی ان کے بہت مانتے تھے اگر بچن صاحب کا خلوص شامل حال نہ ہوتا تو مولوی صاحب میں کہاں اتنا بوتا تھا جو دوسرے دورے کا کڑاکا جھیل پاتے۔ یہ سب ان کی محبت اور عقیدت کا فیض تھا یہاں تک کہ بیچارے نے اپنی کوٹھی بھی ان کو دے دی۔ گو رفاقت کمیٹی نے قیمت ادا کردی۔

کچھ تھڑدلے ایسے بھی تھے جو ان کے اس جان لیوا مرض کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں مولوی صاحب کبھی واقعی اللہ والے ہوا کرتے تھے مگر اب چند موقع پرستوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے قوم کی حمایت کی بدولت مفت خوری کر رہے تھے اس پروپیگنڈے کے ان کے وجود سے کسی کو فیض نہیں پہنچ

رہا تھا۔

اصل میں لوگ مولوی صاحب کی خوشحالی سے جلتے تھے۔ خود
دعائیں مانگتے تھے کہ اللہ پاک اپنی رحمت کے صدقے انہیں بھی کوئی
ایسا مہلک مرض عطا فرما دے کہ ولدر دور ہوجائیں۔ کچھ ٹٹ پونجیے قسم
کے لوگوں نے دورے بھی ڈالے کمیٹیاں بھی قائم کیں چندے جمع کرنے
کیلئے شو کئے مگر کسی بڑے دلچسپی نہیں لی نہ کوئی بڑا فلم اسٹار ہتھے چڑھا
الٹا شو میں روپیہ لگانے والوں کا بیڑا ہوگیا اور خوب جوتا چلا۔

بھائی اصل بات تو یہ تھی کہ اب بچن صاحب منسٹر ہوگئے تھے۔
مولویائن کہتی تھیں سب مولوی صاحب کے دورے کی برکت سے
ہوا۔ ورنہ بچن صاحب ٹکے کے تین نہ پوچھے جاتے اب وہ لمبے ہاتھ
مار رہے تھے کسی کے دورے سنبھالنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور
مولوی صاحب کے معتقدین کیلئے ان کا دم کافی تھا۔ کون نیا بجر بٹو بنا
پھرے۔ خود مولوی صاحب بچن صاحب کی گھپلے بازی پر ماتم کرتے
تھے۔ گرمیوں میں ہمیشہ کی طرح خالی کشمیر پر ٹرخا دیا حالانکہ وعدہ پورے
خاندان کو سوئٹزرلینڈ بھجوانے کا تھا۔ مولوی صاحب یورپ کے
دورے پر شدت سے مُصر تھے تاکہ ولایتی نوٹوں کو بھی ایشیا کی زود نیت
سے فیض پہنچے۔ اگرچہ جگی کی پر پنچ بٹیلر تک ممکن ہے تو مولویوں کا

کیوں محروم رکھا جائے؟

مگر مولویائن بڑے زور شور سے بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں جُٹی ہوئی تھیں۔ انہیں بڑی شدت سے مولوی صاحب کے تیسرے دورے کا انتظار ہے اگر وہ ٹھیک وقت پر پڑ گیا تو اللہ نے چاہا اس دھوم دھام سے بیٹی کے ہاتھ پیلے کریں گی کہ دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔

مگر تیسرے دورے کے خیال سے مولوی صاحب کی مٹی گم ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں تیسری بیوی اور تیسرا دورہ کسی کو راس نہیں آتا۔

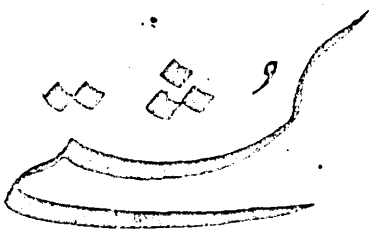

کشتی

چچا وقار بیگ جونہی گھر میں قدم رکھتے لڑکے چپکے ہو بیٹھتے اور انہیں چاروں طرف سے گھیر کر بھوکے کتوں کی طرح ہانپنے لگتے۔ جتنا گھر کی عورتیں اور لڑکیاں بالیاں چچا سے کتراتی تھیں اتنا ہی لڑکے اُن پر جان چھڑکتے۔ کیونکہ چچا چوگنے مرد تھے ان کی رگ رگ سے مردانگی کی پھواریں چھوٹتی تھیں۔ درمیانہ قد تیکھا نقشہ، بھیگی بھیگی آنکھیں، بھرپور نظر سے دیکھ لیتے تو معشوق ماہیٔ بے آب کی طرح قدموں میں آن گرتا اور تڑپنے لگتا۔

کوئی پچپن چھپن کا سن ہوگا۔ مگر خضاب اور کشتیوں کے دھندے

جوان پٹھے بنے بیٹھے تھے۔ اس پچپن سالہ زندگی میں بقول ان کے انہوں نے پچپن کے تالے توڑے ہوں گے۔ صبح اُٹھ کر ڈنڈ بیٹھک لگاتے، مگدر گھماتے حویلی کے مردانہ صحن میں اکھاڑہ کھدوالیا تھا۔ اِدھر محلے کے لونڈوں کو داؤ پیچ سکھاتے۔

چچا جب اپنی مردانگی کے قصے سناتے تو کم سن لڑکوں کی بھی مسیں بھیگ جاتیں۔ آنکھوں میں پریاں ناچ اٹھتیں بے اختیار سرد آہیں بھرنے لگتے۔ جب وہ بھیگی بھیگی آنکھوں میں نشہ چھلکا کر اپنی فتوحات کا ذکر کرتے تو در و دیوار تک آنکھیں مارنے لگتے۔ ہوا چٹکیاں بھرنے لگتی۔ کچے دلوں سے بے اختیار سرد آہیں بھرنے لگتیں۔ سانسیں پھنکارنے لگتیں اور دوڑ دوڑ کر ٹھنڈا پانی پینے کی حاجت بڑھ جاتی۔

اس وقت گھر کی کم سن لڑکیوں کو پھریریاں چھوٹنے لگتیں اور وہ خیر مرئی ہاتھوں سے بچنے کے کونوں میں سمٹ جاتیں۔

خاندان میں بس ساجد خاں ہی تھے جو چچا کو دیکھ کر نہ دولتیاں جھاڑتے نہ کونے کھدرے میں دبکتے، بے چارے نہ اِدھر تھے نہ اُدھر نہ لڑکیوں پہ کبھی ریشہ خطمی ہوئے نہ چچا کے اکھاڑے میں دنگل لڑے مسمی صورت پھرکٹ سینہ اور ٹنڈے جیسے ہاتھ پاؤں، اٹھارہواں برس چل رہا تھا مگر داڑھی مونچھیں کچھ یوں ہی نام چار کو تھیں، دو چار رونگٹے ٹھوڑی پر

اور تھوڑا سا بھورا بھورا رواں گالوں پر، دھڑ دھڑ کے استرا گھستے مگر بقو
پہ چچا۔ سالی داڑھی ہو تو نکلے۔

پہ چچا ساجد نعمان کے وجود کو انسانیت کے دامن پر ایک کریہہ
دھبہ سمجھتے تھے۔ ان کا بس چلتا تو اس قسم کے تمام نامرد ٹھوٹ صفحۂ
ہستی سے مٹا دیتے۔ اسے سر اونڈھائے کتابوں سے بھیجا پچی کرتے
دیکھ کر خون کھول اُٹھتا اور وہ اَوبدا کر ہیجڑوں اور زنانوں کی بزدلی کے
قصے سنانے لگتے۔ ان سب لطیفوں کی تان ساجد پر آن ٹوٹتی۔

پہ چچا نے سب کو ہنسانے کیلئے ساجد کے مختلف نام رکھ
لئے تھے۔ "منا بائی، چھنیا بیگم، پری بیگم، بھوجائی وغیرہ۔"

"اے بی چھنیا بیگم ذرا ایک کٹورا پانی دینا۔"
وہ ساجد کو چھیڑتے اور اس کا ترئی جیسا لمبوترا بے رونق چہرہ
اور زرد پڑ جاتا۔ وہ جب پانی لا کر دیتا تو اور لتھڑتے۔

"خدا خیر کرے میری جان چھنیا بیگم، تمہارے ہاتھ کا چھوا پانی پی
رہنے میں کہیں چھیپ لگ گیا تو تمہاری ایسی کی تیسی ہو جائے گی۔ وہ
پانی لے کر چھیڑتے اور ان کے پٹھو قہقہے اڑا کر داد دیتے۔ اگر ساجد
مرد بچہ ہوتا تو اُسے غصہ آتا، خون چڑھتا، وہ تو یوں ہی کان دبا کر

سب کھوٹی کھری سن لیتا۔ وہ اُدھورا جو تھا۔

چچا صاحب پر لاحول پڑھ کر لڑکوں کو عورت ذات کو ٹھکانے کے داؤ پیچ سمجھانے لگے۔

"میاں عورت کو رام کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے اندھیرے اجالے دھر پٹخو ۔!"

چچا آنکھیں چمکاتے، چچا کے ارد گرد لڑکے یوں بھنبھنا اُٹھتے جیسے میٹھے کے تھال پہ مکھیاں۔"

مگر آج کل کی لڑکیوں کو دھر پٹخنے کے خیال سے ہی لڑکے لرز اُٹھتے۔ کیا تن تنا تھا کم بختوں کا۔ منہ زور اور بے حیا، جمال نے فریدہ پر بھی گر آزمانے کے ارادے سے ایک دن بالکنی میں پکڑ لیا وہ تو بجائے شرمانے اور آہ و زاری کرنے کے قہقہے مار کر ہنسنے لگی۔ اور جاکر اپنے پاپا سے شکایت جڑ دی۔ حد ہے! لڑکی ایسی بات باپ کے منہ پر کہہ دے اور بے شرم باپ نے بھی کمال کر دیا۔ جمال میاں کے باپ کو نوٹس دیدیا۔ کہ اگر پھر تمہارے گلفام نے فریدہ سے بدتمیزی کی تو چالان ہو جائے گا۔"

یہ لیجئے اب کوئی کیسے عشق لڑائے۔ پہلے زمانے کے لوگ ہوتے تو کورٹ کچہری چڑھنے کی دھمکیاں دینے کے بجائے اپنی

بیٹی کو سنکھیا کھلا کر ہمیشہ کیلئے سلا دیتے تھے۔ ناک چوٹی کاٹ کر کنوئیں میں دھکیل دیتے۔

ہمارے ایک رشتے کے دادا تھے۔ ایک دفعہ ان کی بیٹی اپنی خالہ کے ہاں رجب کے کونڈے کھانے جا رہی تھی۔ جب ڈولی بازار سے گزر رہی تھی۔ اس نے پردہ ایسے تھاما کہ دو سفید مرمریں انگلیاں باہر نکل گئیں۔

کسی منچلے نے ایک پھڑکتا ہوا شعر داغ دیا۔ دادا جان کو پتہ چلا تو راتوں رات بچی کو دھتورا کھلا کے ہمیشہ کیلئے سلا دیا۔ یہ قصہ ہمیں بڑا متبرک واقعہ کہہ کر سنایا جاتا تھا۔ کیسے حساس تھے پرانے زمانے کے لوگ! اب تو عورتوں نے شرم و حیا بیچ کھائی ہے۔ برقعوں کو آگ لگا بیٹھیں۔ عورتیں دن بدن سروں پر چڑھتی آتی ہیں سب چچا جیسے کچھ لوگ اب بھی زندہ ہیں اور خاندان کی شان سمیٹے بیٹھے ہیں۔

یہ چچا لڑکوں کو ان جنگلی لڑکیوں کے سامنے گگیاتا دیکھتے تو ان کا خون کھول اُٹھتا۔ "سالو! تم سب ہیجڑے ہو"۔ اور پھر اپنے زمانے کے ایسے دہکتے ہوئے قصے سناتے کہ لڑکے کرب سے تلملا اُٹھتے۔

سوائے ساجد کے جو نرا بھو جاتی تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ

چچا کی ساری عمر عشق بازی میں گزری۔ مگر انہیں عورت جنس سے شدید گھن آتی تھی۔ عورت کو مرد کا کھلونا سمجھتے ہوئے بھی اس سے نفرت کرتے تھے۔ عورت کا وجود ہی بارِ خاطر تھا، عشق اور عاشقی ان کا مقصدِ حیات تھا۔ ویسے محبوبہ کی چوکھٹ پر سر پھوڑنا۔ اس کے تیرِ نظر سے گھائل ہو کے سسک سسک کر ... اس کے کوچے میں گریبان پھاڑ کر خاک بہ سر گھومنا ان کا مسلک تھا۔

ہر شے میں انھیں اسی کا جلوہ کارفرما دکھائی دیتا۔ ان کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔ پھر بھی اس سے نفرت کرتے تھے۔ اسی لیے وہ اپنی اکلوتی بیٹی نفیسہ کو نفو بیٹا کہا کرتے تھے۔ نفیسہ ان کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ پہلی بیوی اللہ کو پیاری ہو گئیں جب بچے ہوتے ہوتے سڑے گلے، دوسری میاں سے لڑ کر میکے جا بیٹھیں تیسری نے دو چار ادھ کچرے معرکوں کے بعد نفیسہ نبو کو جنم دیا۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد اُجڑے چمن میں بہار آئی۔

گو لڑکی کی پیدائش چچا کے نام پر ایک موٹی سی گالی تھی خیر اللہ نے اولاد کی صورت تو دکھائی جہاں لڑکی ہوئی ہے۔ وہاں لڑکے بھی ہو جائیں گے۔

مگر لڑکے نہ ہوئے پھر بیگم میں کچھ ایسی خرابی پیدا ہو گئی

کہ چوہے کا بچہ بھی نہ ہوا۔ نفیسہ ہی ان کی مردانگی کا واحد ثبوت رہ گئی۔ اس پر وہ بے طرح جان چھڑکتے تھے۔ چچا اسے لڑکا بنانا چاہتے تھے۔ بڑی واویلا مچائی مگر چچی نے چھٹی کے اندر اس کے کان چھدوا دیئے۔ جونہی پیروں چلی پیر جھنیاں ڈال دیں۔ چچا اسے بیٹا ہی کہتے رہے۔ وہ بولتی بھی لڑکوں کی طرح تھی، کھاؤں گا، جاؤں گا، لونڈوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتی۔

اللہ کا دیا بھی ایک پھوٹسڑا تھا۔ اماں باوا دیوانے تھے اس پر اگر اسے چھینک بھی آجاتی تو انہیں بخار چڑھنے لگتا۔ رات برات کسی نہایت ان گھڑ شے کی فرمائش کرتی تو چچا اس کی ضد پوری کرنے کیلئے سارا شہر تل پٹ کر دیتے۔ ایک دن سوتے سوتے ایک دم دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ لوگ بہلاتے بہلاتے شل ہو گئے، تب بڑی مشکل سے بولی۔

"فالسئی چوڑیاں ابھی پہنوں گی"

کسی نے بھی تو نہ کہا۔ نامراد یہ چوڑیاں پہننے کا کون سا وقت ہے صبح تو ہو لینے دے۔ گو چچا فوراً اچکن گلے میں ڈال چوڑیوں کی تلاش میں نکل پڑے۔ اور جب صبح چار بجے شاہزادی بے نظیر کی فرمائش پوری کر کے لوٹے۔ نہ جانے کس کس کے آگے ہاتھ پیر جوڑ کر چوک کی دکان کھلوائی۔ بارش میں الگ بھیگے جب فالسئی

چندریاں لے کر لوٹے تو نعفو بیٹا سو چکا تھا۔

اور صبح اس نے چوڑیاں دیکھ کر ایک دم مچلنا شروع کر دیا ایسی نہیں..... ریشمی چوڑیاں آسمان کے رنگ کی۔

اور چچا دوڑے گئے آسمانی چوڑیاں ڈھونڈنے۔

لطف کی بات یہ تھی کہ وہ اس کی احمقانہ ضدوں کا ذکر بڑے فخر سے کیا کرتے تھے۔ ان حرکتوں کو اس کی انتہائی ذہانت پر محمول کرتے تھے۔ ناکام و نامراد لڑکوں کی باتیں سن کر وہ مونچھیں ٹٹول کر کہتے۔

"ڈوب مرو سالو! تم میں دم ہی نہیں، ماشاءاللہ جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو گلی گلی لونڈے جنوا کے چھوڑ دیئے تھے۔ ان کے چیلے چپانٹے شرم سے ڈوب مرتے گئے۔ ان میں کوئی بھی ایسا جیدار نہ تھا جس کی فتوحات معمولی نوچ کھسوٹ سے آگے بڑھی ہوں۔ چچا انہیں حقارت سے دیکھتے اور قوتِ مردانگی بڑھانے کے نسخے تجویز کرتے۔ معجونوں، گولیوں اور تیلوں کے نام ازبر یاد کراتے طرح طرح کے کشتے ملنے کا پتہ بتاتے، سانڈے کے تیل کی مالش اور طرح طرح کے لیپ تجویز کرتے۔"

"کثرت سے گوندے گرمی ضائع ہو جاتی ہے باداموں کا حریرہ قوت باہ

کو بڑھاتا ہے؟

مگر آج کل کے لڑکوں کے نہ جانے کیسے ڈھیر ہیں کہ چچا کی بنائی ہوئی دواؤں سے سولہ برس کی عمر سے کچھ ہاتھ نہ آتا۔ لڑکیاں بجائے رام ہونے کے بالکل راون بن جاتیں۔ ٹھیک کہتے تھے چچا، سارے نسب کے بگڑے تھے۔ کوئی بھی مرد میدان نہ تھا جو بزرگوں کی اعلیٰ روایات کو قائم رکھ سکتا۔

لڑکوں کو تو سب ہی شہہ دیتے ہیں لڑکیوں کو پھانسنے اور ان کا بیڑہ غرق کرنے کے گر سکھائے جاتے ہیں مگر لڑکیوں کو پاکباز رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ لڑکوں کو زیادہ سے زیادہ مہر کے سر کرنا چاہئیے اور لڑکیوں کی عظیم دولت ان کی پارسائی اور اچھوتا پن ہے انہیں صرف ایک مرد کا منہ دیکھنا چاہئیے اور وہ بھی نکاح پڑھانے کے بعد یعنی ایک طرف تو کتے سدھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف خرگوشوں کو محفوظ رہنے کا حکم ہے۔ کوئی اپنے لڑکے سے نہیں کہتا کہ عورت کی حفاظت تیرا فرض ہے تو چونکہ مرد ہے پابند ہے، دنیا کا ناخدا ہے تیری ماں بہنیں ہی نہیں دنیا کی سب عورتیں تیری امانت ہیں۔ یہ نہیں کہ اپنا مال رکھ، پرایا مال چکھ۔

مگر توبہ! کیا زنانی باتیں۔ یہ چچا پورے لیڈی کلر تھے۔ زنانہ تے ہوئے مرد تھے، بھنگن، دھوبن، چمارن انہیں سب حلال تھیں سوائے

اپنی بدمزہ بیوی کے، بتیس برس کی عمر میں دم مار کے میاں کو سات خون معاف کر چکی تھیں۔ گھر کے پرانے کوڑے کی طرح کونے میں جا پڑی تھیں۔ روٹی کپڑے کا سہارا تو تھا۔ میکے میں بھاوجیں ایک پل کی روادار نہ تھیں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ران تلے سے گھوڑا کھسک جاتا ہے اور چند لمحے ہوا میں معلق رہنے کے بعد شہ سوار منہ کے بل آن گرتا ہے۔ ایسی ہی ایک منحوس گھڑی آئی کہ بیچارا ہوا میں معلق ہو گئے۔

نفیسہ اپنی خالہ کے ہاں شب برات کا حصہ لینے گئی۔ شام پڑنے لگی اور نہ لوٹی بچوں کو ممتا کا احساس نہیں ہوتا۔ ذرا نہیں سوچتے کہ ان لمحوں میں ان کے والدین کے دل پر کیا گزرتی ہے بچی گیارہویں سال میں تھی جب بہت دیر ہو گئی تو اماں نے نبّو خان کو بہن کے گھر دوڑایا کہ نیک بخت سے چل کے کہو گھر آئے گی کہ خالہ گھر سو رہے گی۔

نبّو خاں حیران پریشان الٹے پیروں واپس آئے کہ بی بی وہاں سے تو اسی دم لوٹ پڑی تھیں اکیلی دوکیلی بھی نہیں اپنے ساجد میاں کی سائیکل پر آئی تھیں پیچھے کے دم میں دم آیا۔ ساجد کے سنگ اس کے بھائی کے گھر چلی گئی ہو گی۔ ساجد تو انتہائی غیر مضر قسم کا انسان تھا۔ ہنگوڑے سے کا ہے کا تکلف محلے کی لڑکیاں بالیاں اس سے سر دھوتے وقت پانی ڈلواتیں دوپٹے رنگ کر ہوا میں انکار اُلار کر سکھواتیں ہاتھ پیر دبواتیں۔ اے ستّو بھیا ذرا سر میں تیل ٹھیک دو۔

"اے بھیا ذرا میری پیٹھ کھجا دو۔"

"کمر میں ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں ذرا کمر دبا دو۔"

بڑی بے تکلفی سے بیویاں اس سے بال صفا صابن اور دوسری اس قسم کی خفیہ چیزیں منگوا لیتیں جو عموماً نائن یا دھوبن سے منگوائی جاتی ہیں۔ وہ تھا بھی نرا گھنّل، کبھی آنکھ اٹھا کے کسی عورت کی طرف نہ دیکھا۔

لیکن جب پتہ چلا کہ سات بجے کی گاڑی ساجد سہارنپور گیا ہے نفیسہ بو وہاں بھی نہیں آئی تو چچی کو دست چھوٹ گئے۔ چچا کہیں مجرے کی دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ دو ڈھائی بجے سے پہلے نہ لوٹیں گے دھواں دھار بارش الگ ہو رہی تھی۔

جب رات کے بارہ بجے دروازے پر جیسے کتیا نے کھر کھر کیا تو چچی لالٹین لیکر سر پر سوپ کی چھتری لگائے دروازہ کھولنے گئیں تو پٹ کھولتے ہی ان کی چھاتی پھٹ گئی۔

خون اور کیچڑ میں لت پت نفیسہ بو دہلیز پر ٹھوڑی ٹکائے جھرجھریاں لے رہی تھی۔ چچا کوئی تین بجے مشتری بائی کے ٹھمکوں کا مزہ لیتے گنگناتے گھر پہنچے تو ان کی ران تلے سے گھوڑا کھسک گیا اور وہ ہوا میں معلق ہو گئے۔

ساجد خان کی الماری میں بڑی نفاست سے وہ ساری

مقوی باہ معجونیں اور روغن چڑھے ہوئے تھے جن کے تیر بہدف نسخے خود چچا نے تجویز کئے تھے۔ اور انہیں دیکھ کر ران تلے سے گھوڑا کھسک کر الیسا سرپٹ بھاگا کہ چچا ساری زندگی کے لئے معلق ہو گئے ००

عشق کا بھوت

میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی —
انھوں نے فیصلہ کیا۔

"تو مر جاؤ۔" جی چاہا کہہ دوں۔ مگر نہیں کہہ سکتی۔ بہت سے رشتے ہیں۔ جن کا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک تو بدقسمتی ہے۔ ہم دونوں عورت ذات ہیں۔ نہ جانے کیوں لوگوں نے مجھے طبقۂ نسواں کا حامی اور مددگار سمجھ لیا ہے۔ شاید اس لئے کہ میں اپنے بھتیجوں کو بھتیجیوں سے زیادہ ٹھوکا کرتی تھی۔

بخدا میں کسی خاص جنس کی طرفدار نہیں بھتیجیاں

نسبتاً سیدھی اور بھتیجے نہایت بدذات واقع ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں ہر ذی ہوش انھیں تنبیہہ کرنا فرض انسانیت سمجھتا ہے مگر یہ کیسے انھیں سمجھاؤں، وہ مجھے اپنا ہمدرد تسلیم کر چکی ہیں۔ اور وہ لڑکی جس کی نوبت کسی کے بغیر زندہ نہ رہ سکنے پر آگئی ہو۔ قدرے ضدی واقع ہوتی ہے لہذا میں کچھ بھی کروں، اپنی ہمدردی سے منکر نہیں ہوسکتی۔ طوعاً کرہاً مجھے ان کے ہمدرد اور بہتری چاہنے والوں کی قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے

بدقسمتی سے میری صحت ہمیشہ اچھی رہی۔ اور بیمار ہوکر مرغی کے شوربے اور انگور کھانے کا موقع بہت ہی کم دستیاب ہوا ہے۔ یہی وجہ تھی۔ شاید کہ کبھی جان لیوا قسم کا عشق نہ ہوسکا۔

ہمارے ابا ضرورت سے زیادہ محتاط قسم کے آدمی تھے ہر بیماری کی قبل از وقت روک تھام کر دیا کرتے تھے۔ برسات آئی اور پانی اُبل کے ملنے لگا۔ آس پاس کے سارے کنوؤں میں دوائیں پڑگئیں۔

سودا سلف والوں کے چالان کروانے شروع کر دیئے۔ ہر چیز ڈھکی رہے۔ بیچاری مکھیاں غصے سے بھنبھنایا

کرتیں، کیا مجال جو ایک ذرہ بھی مل جائے۔ ملیریا پھیلنے سے پہلے کونین حلق سے اتار دی جاتی اور پھوڑے پھنسیوں سے بچنے کیلئے چرائتہ پلایا جاتا۔

عشق کی روک تھام کیلئے نہ جانے انھوں نے کون سے جوشاندے پلا رکھے تھے کہ کسی بھی بھائی بہن کو مہلک قسم کا عشق نہ ہو پایا۔

یونہی کبھی زکام کھانسی معمولی بدہضمی کی طرح کسی کو عشق ہو گیا تو بزرگوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ نہ عاق کرنے کی دھمکیاں ملیں نہ زہر کھانے کی نوبت آئی۔

لوگ کہتے ہیں جب کسی کو عشق لگ جاتا ہے تو کھانا پینا اور سونا حرام ہو جاتا ہے ۔ مگر ہمارا خاندان عجیب خیلا تھا کہ جب کوئی ضرورت سے زیادہ ہنستا کھیلتا اور موٹا ہوتا پکڑا جاتا تو عموماً وہ کسی کے عشق میں مبتلا پایا جاتا ۔ اس لئے بقول ان کے مجھے ان کے درد کا اندازہ نہیں ۔ انھیں نہایت مہلک قسم کا عشق ہے اور میں ہنس رہی ہوں۔

مجھے یاد ہے ہم لوگ ایک بار پرانی "ہیر رانجھا" دیکھنے گئے تھے۔ جب رانجھا صاحب کی مرمت ہوتی

تو ہم لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔ ہمارے گرد بیٹھی ہوئی آبدیدہ بلیک سنے ہماری بدمذاقی پر سخت نفرت کا اظہار کیا۔

مگر میری ہم جنس میری دوست۔ اپنے محبوب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔ وہ انھیں جلاتا ہے کلستا ہے ذلیل کرتا ہے۔ درِ معشوق پہ جبہ سائی کیلئے جاتی ہیں۔ تو دروازہ بند کر لیتا ہے۔

" میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ۔ "

وہ ہزار بار اس سے کہتی ہیں۔

" میں تمہارے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا ۔ "

وہ ہزار بار جواب دیتا ہے۔

تب وہ روتی ہیں۔ جان دینے کی دھمکیاں دیتی ہیں مگر وہ کانوں میں تیل ڈال لیتا ہے۔ وہ اس کے سارے دوستوں اور جان پہچان کے لوگوں سے التجا کر چکی ہیں۔

ایک انسان کی حیثیت سے انھیں زندہ رہنے کا حق ہے یہ ترقی پسند لوگ ایک حساس لڑکی کی تمناؤں کا خون ہوتے کیونکر دیکھ سکتے ہیں۔ جی ہاں بدقسمتی سے میں بھی ترقی پسند لوگوں میں گن لی گئی ہوں۔ اور مجھ پر یہ بھی الزام ہے کہ میں قطعی ترقی پسند

نہیں۔ کیونکہ میں اپنی ہی جیسی ایک عورت کی دل شکنی ہوتے دیکھتی ہوں اور میرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

صاحب میں اپنے کان پر جوں چھوڑ ہاتھی رینگا نے کو تیار ہوں۔ مگر للہ کوئی بتائے میں ان کے محبوب کو کس طرح ان کیلئے پھانس سکتی ہوں۔ کاش وہ ایک مرتبان ہوتا یا مٹی کا پیالہ تب یا تو میں اپنی پیاری دوست کیلئے اُسے خرید لاتی۔ عجائب خانے میں ہوتا تو چرا کر لانے کی کوشش کرتی مگر وہ تو نہایت ڈھٹائی سے موٹر میں دندناتا پھرتا ہے۔ ہوا کو کون مٹھی میں پکڑ سکتا ہے دھوپ کو قید کرنے کا آلہ ابھی تک ہندوستان میں تو ایجاد نہیں ہوا ہے۔ اس چھلاوے قسم کے عاشق کو کون گھیر کر ان کے ڈربہ میں ہانک سکتا ہے۔"

قصور اس چھلاوے کا بھی ہے، دل پھینک قسم کا ہے ایک بار اس نے ان کی طرف بھی چھکا مار دیا تھا۔ میٹھی میٹھی باتیں ان کے کانوں میں بھی پرو دی تھیں۔ انھیں لئے لئے بھی گھومتا تھا انھیں سردی لگ رہی تھی تو سوئیٹر خرید کر پہنا دیا۔ بیڑے کھلائے اور شاید چوما چاٹا بھی ہوگا۔

یہ سب تو وہ اپنے فرائض زندگی سمجھ کر ہر ماہ ایک

نئی لڑکی کے ساتھ کیا کرتا ہے ۔ اگر وہ ان سب لڑکیوں سے وعدہ پورا کرتا تو اب تک پوری حرم بھر جاتی ۔ آتا تو ایک موٹر اور اچھی آمدنی کا مالک راہ چلتے کرتا ہی رہتا ہے ۔ اب ہر راہگیر اس کے پیچھے قاضی اور سہرا لے کر دوڑتا رہے ۔ تو بیچارہ دم توڑ جائے ۔

وہ سہرا اور قاضی ناکافی سمجھ کر مجھے بھی سمدھن بننے پر مجبور کرنا چاہتی ہیں ۔ مجھے سمدھن بننے سے چڑ ہے ۔ دولہا اور دلہن تو ایک دوسرے کو مل جاتے ہیں ۔ سمدھنوں کو صرف گالیاں ملتی ہیں ، یا پھر پھولوں کی چھڑیاں ۔ جن میں پھول کم اور چھڑیاں زیادہ ہوتی ہیں ۔

میری ایک اور سہیلی کو بھی مرض عشق نے آگھیرا تھا ۔ ان کے عاشق نے حسب عادت انھیں سبز باغ دکھائے مگر شادی نہ کی ، کچھ گڑبڑ ہو جاتی تو اسپتال لے جا کر علاج کروا دیتا ۔ وہ اس علاج سے ہی مطمئن تھیں ۔ دوران علاج وہ اپنے عاشق کی بیوی کہلاتی تھیں ۔ ویسے وہ ان کے بڑے لاڈ کرتا تھا ۔ ساری تنخواہ ہاتھ میں تھما دیتا تھا ۔

سیاہ و سفید کی وہ مالک تھیں ۔ مگر پکا کاغذ کرنے سے دم چراتا تھا ۔ میری بدقسمتی کہیئے یا شامت اعمال جب چوتھی بار گڑبڑ ہوئی اور اسپتال جانے کی نوبت آئی تو وہ حسب عادت روٹھ

پیٹی مرہم پٹی کیلئے میرے پاس آئیں۔

"مت جاؤ اسپتال ۔"

میں نے یونہی بے سوچے سمجھے رائے دیدی۔

"ایں۔؟" ..... وہ چونکیں .... "مگر بچے کو کون

پالے گا۔"

"اس کا باپ پالے گا۔"

"مگر بدنامی جو ہوگی ۔"

"افوہ۔!" میرا جی جل گیا۔ یعنی آپ اب بڑی نیک نام

ہیں۔ آپ کے دن جتنے مار مار کر سڑک پر دھکیل کر کنڈی لگا لیتا

ہے۔ دوسری لڑکیوں کی خاطریں کرتا ہے۔ آپ سڑک پر منڈلایا کرتی

ہیں۔ سامنے ہوٹل میں بیٹھی انتظار کرتی ہیں کہ کب نئی لڑکیاں

پٹ کر باہر نکلیں اور وہ ہنس پڑیں۔" یہ تو کوئی بدنامی نہیں ہوتی۔"

"تم اس سے محبت کرتی ہو ۔ ؟"

میں نے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ۔"

واقعی پوچھنے کی بات نہیں تھی۔ وہ اس مرکھنے بیل

کیلئے اپنی بچی اور شوہر تک کو چھوڑ آئی تھیں۔ جس نے بل کر پانی

نہیں پیا تھا۔ وہ اُس سفاک کیلئے چولہا جھونکتی تھی۔ اس کے بسانڈے کپڑے دھوتی تھی۔

شراب پی کر اتنا مارتا کہ اُلو بنا دیتا۔ یہ سوچا ہوا منہ لئے اس کی سیوائیں لگی رہتیں۔ اس لئے کہ اسپتال میں داخل کراتے وقت وہ انھیں اپنی مسز بتاتا تھا

" تو پھر اس کا بچہ نہیں پال سکو گی۔ "

وہ سوچ میں پڑ گئیں اور تھوڑے ہی دنوں بعد ایک دم ان کی شادی ہو گئی۔ ہم دوڑے دوڑے گئے مبارک باد دینے۔ میاں بیوی دونوں نے نہایت سرد مہری سے ہماری طرف دیکھا۔ اور فلیٹ میں تالا ڈال کر سینما چلے گئے۔ اب ہم بھونچکے رہ گئے کہ ہم نے تو ترکیب بتائی اور ہم ہی دودھ کی مکھی بنے۔

معلوم ہوا دولہا اس لئے خفا تھا کہ ہم نے لڑکی کو بہکا کر اُسے پھنسا دیا۔ دلھن اس لئے ناراض تھی کہ ہم نے اس کی بڑی بڑی گتیں بنتی دیکھی تھیں اور اب وہ نہایت اونچی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا پسند کرتی تھی۔ اور ہم اس کے بھیانک ماضی کی یادگار تھے۔ دولہا کچھ دن بعد پھر مرکھنا بیل بن گیا۔ انھیں مارتا ہے۔ نئی لڑکیوں سے دوستی کرتا ہے۔ پہلے شاید

اس کا ضمیر ملامت کرتا تھا کہ ایک مجبور عورت کو نسخہ کی ذلت دے رکھی تھی۔ اب اس کا دل صاف ہے اور شریف آدمیوں کی طرح اسے ٹھوکتا ہے اور روپیہ عیش میں اڑاتا ہے۔

حالانکہ یہ نسخہ ایک مرتبہ الٹا پڑ چکا ہے۔ مگر اپنا پیچھا چھڑانے کیلئے میں نے پھر اپنے محبوب کے بغیر زندہ نہ رہ سکنے والی اپنی دوست کو تھما دیا۔

وہ بہت غصے ہوئیں۔ کیا سمجھتی ہوں انھیں۔ "

میں نے دیکھا۔ یہ نسخہ استعمال نہیں کریں گی بس وہیں جما دیئے ہیں تاکہ خود ذمہ داری سے الگ ہو جاؤں۔ لوگ کہیں گے میں معصوم لڑکیوں کو کتنی غلط اصلاح دیتی ہوں۔ میں واقعی خود بہت نادم ہوں۔

دراصل میں عشق کے معاملے میں نہایت تھرڈ کلاس اصلاح کار ہوں۔ میں نے عشق کو ہمیشہ مقوی دل و دماغ سمجھا ہے۔ میں طاعون اور ہیضہ کی شدت رکھنے والے عشق کے حق میں سم قاتل ہوں۔

۔ میری محبت پاک اور روحانی ہے۔

انھوں نے غرور سے گردن اکڑائی۔

"محبت ہمیشہ ہی پاک ہوتی ہے۔"

"ایک دیشیا کی محبت بھی۔؟" وہ جل گئیں۔

"وہ سب سے زیادہ پاک اور مقدس ہوتی ہے۔"

"جسم فروشی کو مقدس مانتی ہیں۔؟"

"بیوپار کا نہیں، محبت کا ذکر تھا۔ رہا روحانی عشق تو اس سے کیا مطلب ہے پرستش۔؟"

"ہاں۔" وہ جوش سے جھوم اٹھیں۔

"تو کون منع کرتا ہے۔ پرستش کرو۔ ڈٹ کر کرو۔ اس میں اس ناچیز سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تخیل بھی حرامی، حلالی ہوا کرتا ہے۔ تم شوق سے اسے اپنا روحانی شوہر بنا لو۔ وہ تمہارے چنگل سے نہیں نکل سکے گا۔"

"آپ نہیں سمجھتیں۔"

"میں خوب سمجھتی ہوں۔ مجھے خود سہگل سے عشق تھا اس کی آواز سن کر کلیجہ نکل پڑتا تھا۔ موتی لال سے عشق تھا۔ اشوک کمار نے نیندیں اچاٹ کر دیں۔ اور تو اور کسی زمانے میں گرو دیو ٹیگور سے عشق ہو گیا تھا۔ جی چاہتا تھا، جوگن بن کر شانتی نکیتن میں جان دے دوں۔ مشرت بالو اُر سکم

یتے ، ایک ٹانگ پر کھڑی رہو تو مجھے عذر نہ ہوتا۔ کسی سے کہنا
یں ، مجھے پال راسن سے تو ایسا شدید عشق ہوا تھا کہ خدا کی پناہ۔
ں کے ریکارڈ سن کر گھنٹوں سر دھنا ہے۔ اب بھی بخدا ایسے
یسے لوگوں سے عشق ہے کہ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے
یں۔ اگر کسی کو میرے عاشق مزاج دل کی دید : دلیوں کا پتہ
ل جائے۔ تو اندھیرا ہو جائے۔

لوگ میرے سائے سے بھاگنے لگیں اور ... تمام
خاطر شارع عام پر ذرے لگائے جائیں۔ مگر ان ... سے
ی بھی سورما سے شادی کا شوق نہیں۔ اگر ان لوگوں کی ...
ی حرکت سے مجھے ان کی بدنیتی کا شبہ ہو جائے تو ... عزت
... دعویٰ کر دوں۔

میری جان ! شادی اور عشق کو گڈمڈ نہ کرو۔ کیا ... ہو شادی
کے بعد عشق نہیں ہو سکتا۔ ... تو خیال ہے عشق صرف مردوں ... ہیں
ہوا کرتا مگر وہ بھی شادی ... شوق سے نہیں ... کہہ سکتی کیونکہ ... ابھی
... مردہ نہیں ہوئی۔

آپ مذاق کر رہی ہیں۔ ... سے ...
نہیں کہ ٹیگور سے عشق کر لیا جا ...

" تو صاف کہو عشق سے تمہارا مطلب معہ مہر اور حق طلاق ہے
تم نری بنئے کی بیٹی ہو۔ سخت بیوپاری ذہنیت ہے تمہاری۔ لیلیٰ
ہوتی اس وقت تو عشق کی ہتک کرنے کے سلسلے میں تمہیں اپنے
اونٹ کے پیچھے کھل دیتی۔

میری صلاح مانو تو کسی بھلے مانس سے شادی کرلو۔ بیٹے
کا نام اپنے عاشق نامعقول کے نام پر رکھو اور اُسے وقتاً فوقتاً
پیٹ کر دل کی بھڑاس نکال لیا کرنا۔

عاشق سے شادی کرنا سخت بدمذاقی کا ثبوت ہے ۔
بدمذاق لوگ لیمن ڈراپ کو چبا کر نگل جاتے ہیں۔ لیمن ڈراپ چوس
کر کھانے کی شے ہے۔ خدارا عاشق کو گرہستی کے جوئے میں
مت جوتو۔ ذرا سوچو یہ دلچسپ کار جو ہزاروں دلوں کی دھڑکن بنا ہوا
ہے مستقل گھر والے کی صورت میں آن ڈٹے تو پھر دل کس
لئے دھڑکے؟ یقین مانو وہ بھی انسان ہے، کھاتا ہے، پیتا
ہے، سوتا ہے، لڑتا ہے، کنجیاں کھو دیتا ہے۔ کاغذ بکھیرتا
ہے۔ وعدہ خلافیاں کرتا ہے، سینما کے ٹکٹ خرید کر بھول جاتا
ہے۔ اور یقین مانو جیسے بڑے سو بالا اور دجینتی مالا کیلئے خودکشیاں
کرتا پھرتا ہے، آہیں بھرتا ہے۔ بیوی کیلئے نہیں مرے گا۔

ں سے شادی کر کے دل ٹوٹ جائے گا ۔ کیا سمجھتی ہو تم ؟
ِشن چندر سے شادی کر لو۔ وہ کبھی تمہاری ساڑھی "مہالکشمی
پل" پر نہیں باندھے گا ۔ بلکہ نہایت بھونڈے پن سے
ں قمیض ٹانکتے وقت تمہاری ساڑھی کیچڑ میں گرا دے گا ۔ اور اللہ
یں پھوہڑ کہے گا ۔ سا سر ہاتھ آ جائے تو کبھی تمہارے ریشمی
ل سے آنسو نہ پونچھے گا ۔ نہ تمہاری مرمریں باہوں کا سہارا
لے گا ۔ سردار جعفری سے تو بھول کر شادی نہ کرنا ۔ تمہارے
ں تک میں کتابیں اور کاغذ بھر دے گا اور وقت بے وقت
بیچنے والوں کی طرح لڑے گا ۔ ذرا بھی عقل رکھتی ہو تو خدا کا واسطہ
ن فنکاروں سے شادی نہ کر لینا ۔ ورنہ سر پکڑ کر اپنی حماقت پر
وؤ گی ۔ یہ خواب ہیں ۔ انھیں حقیقت بنانے کی کوشش نہ کرنا
ہر ایک نہایت ٹھوس حقیقت ہوتی ہے ۔"

وہ میری عقلمندی کی باتوں سے مرعوب ہو گئیں ۔ خوشی
سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ کون کہتا ہے میں بے تکی
اتیں کرتی ہوں ۔ ایک عشق زدہ لڑکی کو راہ راست پر لگا دیا ۔
اب یہ دھوم دھام سے شادی کرے گی ، بچے جنے گی ، دنیا میں
سجے گی ، بھئی مجھے تو قوم کی لیڈری کرنی چاہیئے ۔

مگر میری لیڈری کے خواب گداگد کر کے نیچے آن پڑے
جب میں نے سنا کہ اسی شام انھوں نے اپنے بدذات عاشق
کے مورچہ پر بزن بول دیا ہے۔
اس کی بیمار تنکا سی اماں کو جلسو کے پہلوانی ہاتھ دکھا
"یہ میرا گھر ہے۔ میں یہاں سے کبھی نہیں جاؤں گی۔" انھوں نے
پکی گرہستن کی طرح اعلان کیا۔ "تم اس کی ماں نہیں، ڈائن ہو
اس کی کمائی پر ناگن بن کر بیٹھی ہو۔" ہونے والی بہو نے چیخ
کر کہا۔ اور بڑی مشکلوں سے دھکے دے کر انھیں گھر سے
نکالا گیا، تب نکلیں۔
اب میری کم بختی دیکھیے! جیسے یہ سارے دھکے میرے
ہی پیٹھ پر لگے۔ لوگ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ میں نہایت احمق
ہوں۔ "میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" وہ بڑے وثوق
کہتی ہیں۔ تو مجھے کیوں اعتراض ہے؟ میں ان سے کہہ کیوں
نہیں دیتی؟
"تو مر جاؤ۔"
خیر آئندہ کہہ دوں گی

ثواب

بہن خدا کا واسطہ بتائیے کیا کروں ؟ "
سکینہ بہن نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔
" بھئی میری تو یہی رائے ہے کہ فرحت کو طلاق دلوا دیں۔ "

ہے ہے طلاق ۔ " وہ لرز اُٹھیں " آج تک خاندان میں طلاق نہیں ہوئی۔ پھر دوسری بیٹی رضیہ چھاتی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ ناک کٹ جائے گی۔ پھر اُسے کون پوچھے گا ۔ ایسی پیاری بیٹیاں ہیں لیکن بَر نہیں جڑتے ۔ " بَر کے معنی صرف

تندرست، قبول صورت نوجوان ہی نہیں ؟ بَر کے لیے لازمی ہے
کہ وہ بھاری تنخواہ پاتا ہو۔ اچھے کھاتے پیتے خاندان کا ہو۔ کچھ آگے
پیچھے کام آئے۔ ویسے مرد ذات کی کمی نہیں۔ بڑی بیٹی کے لئے
کنوئیں میں بانس ڈالے تب کہیں جا کے لڑکا جڑا۔
لڑکا ماشاء اللہ سے ۶۰، ۶۵ کا ہے، ایک بیوی اور چار
لڑکیاں ہیں پر بیٹا نہیں۔ بیٹے کیلئے فرحت سے شادی کی تھی
سو اس کے نصیب پر پتھر پڑ گئے۔ چھٹا سال چل رہا ہے بیٹا
چھوڑ، بیٹی ہی نصیبوں جلی ہو جاتی۔ پھل تو لگتا۔ لیکن وہاں بھولے کو
دن بھی نہ چڑھے۔ کتنے تعویذ گنڈے کئے۔ اجمیری خواجہ آئے
بھی سکینہ دکھیا کی نہ سنی۔
" اسے بھی تعویذ گنڈوں کے پھیر میں نہ پڑیے۔ اچھے
ڈاکٹر کو دکھایئے۔"
" ڈاکٹر سے ڈاکٹر و کھائے ؟ سب موئے یہی کہتے ہیں
لڑکی میں عیب نہیں۔ بس بہن اللہ کا فضل ہے ہوا ہوا تو
اس میں کسی کا کیا دخل۔"
" شاید امداد میاں ہی میں کچھ عیب ہو گیا ہو ؟"
" نہیں بہن مرد ذات میں کہاں عیب ہوتا ہے لوگ

کہتے ہیں کہ تیسری شادی کر لو، انھیں کیا کمی ہے لڑکیوں کی۔ اچھے اچھے لوگ بیٹیاں تھال میں سجا کے دینے کو تیار ہیں۔

فرحت نے مجھے ایک دن سینما دکھایا تھا۔ آج کل پکچر ہال کا رنگ ملایا ہوا ہے۔ گو اچھا رنگ ہے۔ جس میں ہیروئن کا ابھرا جسم ان کو تو دے بچپنے کا غم کھائے جاتا ہے لیکن خود فرحت کے دل پر کیا گزرتی ہے مشکل سے باتیں تھیں کا رن ہوگا۔ ابھی تو والدہ بیچاری ہی ان لوگوں سے میل جول بڑھ گیا تھا۔ کسی روڈ پر ان کا پیار کرنا کا فلیٹ ہے۔ بڑی آن بان سے بیاہا ہوا۔

بجلی جیسی گھار میں اپنے اماں ابا کے ساتھ رہتی ہے۔ یہ فلیٹ خاص طور پر فرحت کیلئے لیا ہے۔ لیکن اس کے نام نہیں کرتے۔

"شادی کیجئے امداد میاں کو، فرحت کو ہزاروں لڑکے مل جائیں گے۔" مجھے انور کا خیال آیا وہ ان دنوں میرے ساتھ ہی رہتا تھا۔ "ساڑھے پانچ سو ملتے ہیں۔ ترقی ہو جائے گی۔"

اس دن سینما میں فرحت کی نظریں بار بار انور پر اچٹ رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ بھی بڑی مہربان نظر آ رہی تھیں۔

میں نے ان سے ذکر کیا تو کھل گئیں۔

لیے ہے ایسا ہو جائے تو کیا کہنے ہیں ماشاءاللہ کیا چاند سورج کی جوڑی رہے گی۔"

"آپ طلاق دلوا دیجیے بس آگے میرا ذمہ۔"

میں نے وعدہ کیا۔

مگر انور بدک گیا۔

"بھئی میں اس چکر میں نہ پڑوں گا۔"

"کیوں بیوقوف! اتنی اچھی لڑکی ہے۔"

"لڑکی کہاں؟ کس کی بیوی ہے؟"

"طلاق کے بعد......"

"مگر بوڑھی بڑی کائیاں ہے۔"

"ارے رے بیچاری بہت سیدھی ہے۔"

"بڑی چلتی پرزہ ہے۔ مجھے تو اس ملنے سے بارود کی بو آتی ہے۔"

مگر انور بیچارے کی ایک نہ چلی، ادھر سکینہ بہن ادھر سے میں نے وہ ہانکا ڈالا کہ بدحواس کر دیا۔ گھیر گھیر کے ہم دونوں انہیں ایک دوسرے سے ٹکراتے، بڑی بڑی ترکیبیں چل کے انہیں اکیلا چھوڑ کے سرک جاتے۔ سکینہ بیگم آنکھوں میں آنسو بھرتیں

اور شکریہ ادا کرتیں۔

یا تو انور بیٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتا تھا۔ اب یہ حالت ہو گئی۔ جیسے بھوت سوار ہو گیا ہو۔ سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ فرحت نے شادی کی تھی، محبت نہیں کی تھی۔ انور کی محبت نے اسے ایک نئی زندگی بخش دی۔ انور کو سکینہ کی صورت سے نفرت تھی۔ مگر پھر تو وہ ان کا بھی گرویدہ ہو گیا۔ وہ بھی اس پر صدقے واری جاتی۔ اس کے بغیر ان کے حلق سے نوالہ نہ اترتا۔ میری اہمیت بالکل ختم ہو گئی۔

شادی سے پہلے ہی انور سسرال کا ہو رہا۔ رات کے دو بجے تک وہیں گھسا رہتا یا فرحت آجاتی۔ اور دونوں کمرے میں بند ٹھٹھول کیا کرتے۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں کچھ دن کیلئے پونا چلی گئی۔ وہاں سے لوٹی تو معلوم ہوا میرے پیچھے فرحت مستقل طور پر گھر میں رہی۔ کبھی کبھار اپنے گھر میں چلی جاتی۔ اب تو شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ دونوں کی محبت عروج کو پہنچ چکی ہے۔

"آپ کیا کر رہی ہیں؟"

میں نے سکینہ سے پوچھا۔ پہلے تو ٹالتی رہیں پھر بولیں۔

"ہاں! احمد آباد کے ایک سوامی جی نے ایک بوٹی دی ہے۔"

"ارے ہٹاؤ سوامی جی کو۔ یہ لوگ پاکھنڈی ہوتے ہیں

طلاق کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں ؟"

"اس منحوس طلاق کے نام سے مجھے ہول آتا ہے۔"

"لیکن آخر ہوگا کیا ۔؟"

"اللہ اپنا فضل کرے گا ۔"

"ہونہہ ۔ اللہ تو کب اپنا فضل کرے گا ۔ سر پکڑ کے رو دیں گی آپ ! ایک جوان لڑکا اور لڑکی کا یوں دن رات ملنا..."

"کیوں، کیا ہوا ، کیا تم سے فرحت نے کچھ کہا ۔؟"
وہ چونک پڑیں ۔"

"نہیں فرحت نے کچھ نہیں کہا ۔ مگر میری کیا آنکھیں نہیں ہیں ۔؟"

میں بہت دیر تک انہیں اونچ نیچ سمجھاتی رہی ، وہ بہت دکھی سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتی رہیں ۔

"سوامی جی نے سات پڑیاں دی ہیں ۔ ہر منگل وار کو ایک پڑیا پانی یا گرم دودھ کے ساتھ ۔"

"فرحت کو دی ہیں ؟"

"نہیں امداد میاں کو !"

"امداد میاں کو ۔۔ ؟" میں جل کر رہ گئی ۔ "سات

پڑیاں کیا، انہیں رات ایٹم بم بھی نگلا دیئے جائیں تو کچھ نہ ہوگا۔
کیا امداد میاں آتے ہیں۔؟"

" ہاں ہر منگل وار کو آتے ہیں نہا دھو کر دو رکعت شکرانہ پڑھ کے گرم دودھ کے ساتھ اور ......"

" اور بھی؟ یعنی حد ہو گئی ۔ یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟"

" اے بہن تو وہ اس کا شوہر ...."

" مگر ... انور اور امداد میاں ...... یعنی یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے بتاؤں ۔ کیا یہ کم بخت اندھی ہے؟ مگر میری ہمت نہ پڑی۔

" اگلے منگل وار کو یہی پڑیا دی جائے گی ۔" وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی ۔ " سوامی جی کہتے ہیں اللہ نے پانچویں پڑیا ...."

" سکینہ بہن اللہ کے واسطے یہ مذاق اچھا نہیں ۔ اب فرحت کی طلاق کیلئے کچھ کیجئے اور کم بخت امداد میاں سے مہر [illegible] لیجئے۔"

میں نے سوچا، انور اور فرحت الگ [illegible] بڑے مزے سے شروع کرسکیں گے۔

"اے ہے؟"

سکینہ بی بھونچکی رہ گئیں۔

"کتنا ہے مہر ۔ ؟"

"خاک بھی نہیں ۔ اب آپ سے کیا چھپانا ۔ بچپن ہزار مہر تھا تو دس ہزار سرفراز میاں لے کے ولایت چلے گئے ۔ ایسے سدھارے ہیں کہ پلٹنے کا نام ہی نہیں لیتے ۔ وہیں میم سے شادی کرلی ۔ ایک بچی بھی ہوگئی ۔

سرفراز میاں سکینہ کے بڑے بیٹے کے ایک دوست کی معرفت فرحت کا رشتہ ہوا تھا ۔

عمر زیادہ تھی امداد میاں کی ۔ مگر بیٹے کے مستقبل کا سوال تھا کسی قابل ہو کر آگئے تو خاندان کی گرتی ہوئی حالت سنبھل جائے گی ۔ سو وہ پلٹے ہی نہیں ۔ اسلئے چھ ہزار اور منگا لیے کرائے کے نام سے ۔ امداد میاں بچے بنیئے نکلے ۔ سب مہر کے حساب میں لکھوالیا ۔"

"مگر یہ تو ہوئے سولہ ہزار ۔ باقی ۔۔۔۔ ؟"

"ورلی پر فلیٹ ہے ۔۔۔۔۔ وہ رضیہ کے نام ہے ۔ میں نے کہا چلو تو ہو نیک بخت کیلئے ۔ آج کل کے لڑکے کر منہ پھاڑ رہے دو وقت رہے ہیں ۔"

مجھے فرحت پر سب دل سے ترس آنے لگا ۔ بھائی کے مستقبل اور بہن کی شادی کے لئے اس کی زندگی مٹی میں ملادی ۔ ایسی

ماں اور نائکہ میں کیا فرق ہے ؟ اور اسی لئے سکینہ بیگم طلاق سے بوکھلائی جاتی ہیں ۔ "

" بہن اگر امداد میاں نے اور شادی کرلی تو ہم لوگ کہیں کے نہ رہیں گے ۔ کیسے کیسے میں نے پاپڑ بیلے ہیں ۔ وظیفے پڑھے ہیں منتیں مانی ہیں ۔ جبھی تو شادی نہیں کی ۔ ورنہ لوگ تو انہیں خوب بھڑکا رہے ہیں ۔ "

مجھے وحشت ہونے لگی ۔ کتنی بیوقوف ہے یہ عورت ! کچھ سمجھتی ہی نہیں ۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو کیا ہوگا ؟ "

" دیکھئے آپ کچھ فکر نہ کیجئے ، آپ انور اور فرحت کیساتھ رہیں گی ۔ رضیہ کی بغیر فلیٹ کے بھی اچھی شادی ہوجائے گی ۔ آپ طلاق کی فکر کیجئے ۔ "

انھوں نے ہوں ہاں کرکے ٹالدیا ۔

اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا ۔ دو چار دن سے انور کچھ بوکھلائے سے پھر رہے تھے ۔ فرحت بھی کچھ ویران سی نظر آرہی تھی ۔ میں نے پوچھا

" کیا کچھ جھگڑا ہوگیا ۔ ؟ "

تو دونوں گھبرا گئے ۔

رات کو کچھ عجب دھما چوکڑی سی انور کے کمرے میں مچی ہوئی تھی۔ اندر سے فرحت کے رونے کی آواز آ رہی تھی

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"اندر آئیے — "

وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر لے گیا۔ "اس بیوقوف کو سمجھائیے۔"

"کیا ہوا۔؟"

"آنٹی — !"

وہ میرے پیروں سے لپٹ گئی۔

"یہ کھڑکی سے کود کر — ...."

انور بری طرح لرز رہا تھا۔

"پاگل ہوئی ہو — ؟" میں نے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یوں رو رو کر ہلکان ہونے سے فائدہ؟ طلاق کے بعد ....؟"

"ہائے آنٹی جی! امی طلاق کے نام پر منہ پیٹے لیتی ہیں کہتی ہیں سنکھیا کھا لوں گی۔"

"ان کا ہم محبت کا تجربہ بگڑ گیا ہے — تم خود بالغ ہو طلاق لے سکتی ہو — اور پھر اب ایسے حالات میں تو .... وہ

راضی ہو جائیں گی ۔ "

" نہیں آنٹی وہ ...... وہ نہیں مانیں گی .....
ہائے میں مر جاؤں "

" مر جاؤ گی مگر آپ بہت کیسے ذرا اپنی امی سے مقابلہ نہیں کر سکتیں ۔ "

" ان کا رونا نہیں دیکھا جاتا ۔ کل انھیں بڑے زور کا دورہ پڑا ۔ دانت بھنچ گئے ۔ بس اتنی سی بات ہوئی تھی ۔ کہ میں نے کہا ۔ انھیں منع کر دو ۔ منگل ڈنگل کو نہ آئیں ۔ میں اُن کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی مجھے گھن آتی ہے ۔ ہائے آنٹی آپ کو کیا بتاؤں وہ تو آدمی نہیں کتا ہے ۔ "

منہ ڈھک کے وہ سسکیاں لینے لگی ۔

" تم نے اپنی اماں کو بتایا ۔ ؟ "

" نہیں ، جب انھیں اصلیت کا پتہ چلے گا ۔ وہ مجھے کاٹ کے پھینک دیں گی ۔ "

" نہیں ! جب انھیں اصلیت کا [illegible] گا تو [illegible] درست ہو جائے گا ۔ [illegible] نے سوچا [illegible] صبح جاکر ان سے سب کچھ [illegible] دوں گی اور [illegible]

اندر طلاق ......"

"طلاق تو وہ مر کر کے بھی نہ لینے دیں گی۔ ویسے ہی ہر وقت کہتی ہیں تو تو خاندان کا نام اچھالے گی۔ تیرا کیا ہے دوسرا خصم کر، پھر تیسرا کر۔"

میں نے اُسے سمجھایا، یقین دلایا۔ اس کی ڈھارس بندھ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں مسکرانے لگی۔ روئی روئی شکل پر ہنسی کچھ ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ انور کی نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرے پر جھک گئیں۔

میں ان دونوں کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند اُڑ گئی۔

"اگر امداد میاں کو پتہ چل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ انور ملٹری میں ہے۔ کم بخت کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ امداد میاں کی پہلی بیوی تو اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔ سکینہ بیگم اور فرحت کی دھجیاں اڑا دیں گی۔"

ڈرتی ڈرتی میں صبح ان کے پاس پہنچی۔ حسب عادت وہ سکر منہ سی بیٹھی تھیں۔ میں نے بڑی رسانیت سے فرحت کی بپتا سنائی۔ قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ انور دغا نہ دے گا۔

تو اس پر جان چھڑکتا ہے۔"

میں چوری گم سم رہ گئی۔ سکینہ بیگ کے کلیجے پر جیسے
ین گن کی باڑھ چل گئی۔ پاگلوں کی طرح ہنسیں اور پھر بچوں
طرح رونے لگیں۔

سوکھے پتے کی طرح ان کا جسم کانپا اور وہ وہیں ڈھیر
ئیں۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ رضیہ کالج جا چکی تھی۔ فرحت
نے کمرے میں بیٹھی کانپ رہی تھی۔ انھوں نے کسی کو کوسنا پیٹنا
میرے منہ پر تھوکا کہ میرے بھائی نے ان کا نصیبہ پھوڑ دیا۔

"آپ اسی وقت وکیل کے پاس چلئے اور فرحت کو میں
نی بہن کے پاس دہلی بھیجے دیتی ہوں۔ امداد میاں پر ہر طرح کا
باؤ ڈالا جائے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔"

ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سر جھکائے
یٹھی رہیں۔

"وکیل۔؟" انھوں نے احمقوں کی طرح کہا۔ "ہاں
راس وقت ..... میں پھر آپ کو فون کروں گی۔ اللہ آپ
و خوش رکھے۔"

انھوں نے آنکھیں بند کر لیں

واپس آکر میں فون کے انتظار میں بدحواس رہی۔ کہیں دونو
ماں بیٹی زہر کھا کر نہ سو رہیں۔ ساری عمر کی تہمت چڑھ جائے
مجھے کیا معلوم تھا کہ حالات یوں پلٹا کھائیں گے۔

انور کا عجیب حال تھا۔ کہتے ہیں مرد بے وفا ہوتے
ہیں۔ عورت کو مصیبت میں پھنسا کر رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ مگر
انور کی تو جان نکلی جا رہی تھی۔ شام تک انتظار کیا مگر فون نہ آیا
جھک مار کر میں نے فون کیا تو جواب نہ ملا۔ جب بہت ہی
بے چین ہو گیا تو میں نے انور کو بھیجا۔

انور واپس لوٹا تو صورت دیکھ کے میرا دم نکل گیا۔

"کیا کہا ۔ ؟"

"گھر میں کوئی نہیں۔ تالہ پڑا ہے۔" گورکھے
سے پوچھا۔ معلوم ہوا سب گئے۔"

"کہاں گئے ۔ ؟"

"کچھ پتہ نہیں ۔ !"

رات انگاروں پر کٹی۔ انور پاگلوں کی طرح دنیا بھر کو

رت رہا۔ امداد میاں کے سسرال فون کیا۔ پتہ چلا۔ کہاں گئے
کچھ معلوم نہیں ۔ شاید ورسودا کے فلیٹ میں ہوں گے۔"
اور دیوانوں کی طرح ورسودا بھاگا۔ میں نے بہت
لیکن اس پر تو بھوت سوار تھا۔

وہاں ایک نوکر تھا۔ اس نے کہا
"کہاں گئے ہوں گے۔ یا چرچ گیٹ اڈا پیڈر روڈ
ن تھا۔ وہاں بھی نہ ملے۔ تین چار دن گزر گئے۔ تب
وم ہوا کہیں باہر گئے ہیں ۔ رہنا ہوگا۔ منحوس
ین چار آفس سے نکلے کہیں نہ معلوم ہو سکا کہ کہاں مر گئے
چھٹے ساتویں دن ایک لفافہ ملا۔ میلا کچیلا پھٹا ہوا۔
یا تھا۔

"خدا کے واسطے مجھے بچاؤ۔ اس جہنم سے نکالو
میری جان پر ایسا پہرہ ہے کہ سانس لینا مشکل ہے
اللہ میری جان پر رحم کرو۔"
فرحت

خط پڑھ کر تو اور سولی سوار ہو گئی۔ مٹی مٹی مُہر
پتہ چلا کہ خط بیگم پیچھے سے ڈاک میں ڈالا گیا تھا۔ اُ
کا مطلب ہے کہ وہ حیدر آباد گئی ہوں گی۔

"کون بچا ہے۔؟"

انور دیوانوں کی طرح حیدر آباد بھاگا۔ اِدھر اُدھ
مار کے لوٹ آیا۔ کچھ پتہ نہ چلا۔

کیا دل پر وحشت تھی۔ اب بھی سوچتی ہوں تو دھ
آنے لگتی ہیں۔

"انور کو کن مصیبتوں سے سنبھالا ہے کہ بس میں ہی جانتی ہوں۔ اس گناہ میں میری مرضی بھی شامل تھی۔ میرے دامن پر بھی بے گناہوں کے خون کے دھبے تھے۔"

اسی سال انور کا تبادلہ دہلی کی طرف ہو گیا۔ میری جان چھوٹی!

اس واقعہ کو کتنے ہی سال بیت گئے۔ انور کو صبر آ گیا۔ چاند سی دلہن اور بچوں نے سب کچھ بھلا دیا۔

میں مارک اینڈ اسپنسر سے نکل رہی تھی اور وہ داخل ہو رہی تھیں۔ ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ تھوڑی دیر ہم احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"نیمی آپ ۔۔ !" وہ سمور کا کوٹ پہنے مجھ سے لپٹ گئیں۔ "اللہ کتنے سال ہو گئے ؟"

"کہیے بہن ۔۔ !"

میرا حلق خشک ہو گیا۔

"شہناز میاں کے ہاں ٹھہری ہوئی ہوں۔" انہوں نے

تو پلٹنے کا نام نہیں لیا۔ میں نے کہا چلو یہاں بھی ناک نیچی کر کے مل آؤں۔ اس بہانے ولایت کی سیر بھی ہو جائے گی۔

"اللہ اللہ کیا بہشت بریں بنایا ہے۔ ان فرنگیوں نے" وہ اٹلی، فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے قصے بیان کرنے لگیں۔

ان کی صورت پر ایک دم اطمینان اور جوانی ٹوٹ پڑی تھی۔ پہلے سے بھاری بھرکم بھی معلوم ہو رہی تھیں۔ کسی اچھے ہیئر سیلون سے بال بنوائے تھے۔ وہ زرد پریشان سکینہ سوکھی ڈال سے ایک دم لہلہاتا بوٹا بن گئی تھیں۔

"فرحت کیسی ہے؟"

میں نے ذرا تکلف سے سوال کیا۔

"اللہ کے فضل سے بہت خوش و خرم ہیں میاں بیوی، نادر میاں بھی تمہارے اسکول جاتے ہیں — ناظم آباد میں کیا لق و دق کوٹھی ہے۔ [illegible] سے کیا پیاری صورت ہے نادر کی — بنا بنایا باپ ہے — باپ — "

جیسے اُلجھن میں پڑگئی

"جی ہاں وہی چٹا رنگ اور نیلی آنکھیں ۔!"

"امراؤ میاں کی نیلی آنکھیں ۔؟"

"اے ہے، آپ تو ایسے بن رہی ہیں جیسے ....؟
وہ ڈھٹائی سے کھلکھلائیں۔

اور جلدی سے سامان ٹرالی میں رکھنے لگیں۔

"اور وہ سات پُڑیاں ۔؟"

میں نے کریدا ۔

"اللہ قسم، آپ کو ایک ایک بات یاد رہتی ہے
پورے چار ہزار دیئے تھے سوامی کو ۔"

"پڑیوں کے یا ترکیب کے ؟"

"وہ نگوڑا تو کچھ اُول فول بکے تھا ۔"

"یعنی اپنی خدمات پیش کر رہا تھا ۔"

"جی ! اور دس ہزار مانگ رہا تھا۔ مگر نیک بخت
کی صورت دیکھتے بخار چڑھے تھا۔

وہ بڑبڑائیں ۔

"امداد میاں کو شک تو نہیں ہوا۔؟"

"اے ہے ہٹا ہیے بھی — دنیا جہان کے مردُوے جو اپنی اولاد پر شک شبہ کرنے لگیں تو ..... بس اب جانے بھی دیجئے۔
اتنی عقل اپنی گرہ میں ہوتی تو میری معصوم بچی پر الزام نہ تھوپتے۔ اپنے بوڑھے گریبان میں بھی ایک بار جھانک کر دیکھتے —
اے مٹی ڈالئے ان باتوں پر دم ٹوٹتا ہے میرا۔"

"انور بے چارا بہت تڑپا۔ آپ لوگوں نے صورت بھی نہ دکھائی بیٹے کی —"

میں نے چٹکی لی۔

"بس جانے دیجئے — یہ جو گلی گلی بچے ٹپکاتے پھرتے ہیں۔ تب کلیجہ نہیں پھٹتا — جیتا رہے اللہ اُسے درجنوں بچے دے۔"

وہ انور کو دعائیں دینے لگیں۔

میں نے ان کے بیش قیمت موٹر کو دیکھا اور پیامنٹا سکاٹ کے اسکارف کو۔ پھر تخیل میں ناظم آباد و بہت پھیلی ہوئی لق و دق کوٹھی کا رقبہ ناپا۔

بٹوے میں سے جھانکتے نوٹ، بہت سے بہت پونڈوں کی گڈی دیکھی اور مجھے بے طرح کوفت ہونے لگی۔

میں کیوں چور بنی بیٹھی تھی۔ فطرت کی گود بھرنے میں میرے شوہر دیال بھی تو شامل تھیں۔ اور انور کتنا بیوقوف تھا برسوں ضمیر کی ملامتیں سہتا رہا۔ جسے وہ اپنی نادانی میں گناہ عظیم سمجھے بیٹھا تھا۔ وہ موجب ثواب تھا۔

کوسنے

جب پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو وہ رحمان بھائی کے پہلے منزلے کی کھڑکی میں بیٹھی لمبی لمبی گالیاں اور کوسنے دے رہی تھیں یہ کھڑکی ہمارے صحن میں کھلتی تھی اور قانوناً اُسے بند رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ پردہ والی بیبیوں کا سامنا ہونے کا ڈر تھا۔ رحمان بھائی رنڈیوں کے جمعدار تھے کوئی شادی بیاہ، ختنہ، بسم اللہ کی رسم ہوتی۔ رحمان بھائی اونے پونے ان رنڈیوں کو بلا دیتے تھے اور غریب کے گھر میں بھی ایک دفعہ وحیدہ جان، مشتری بائی اور انوری کھروا ناچ جاتیں ۔

مگر رحمان ٹولہ کی لڑکیاں بالیاں ان کی نظر میں اپنی سگی ماں بہنیں تھیں۔ ان کے چھوٹے بھائی بندو اور گیندا آئے دن کی تاک جھانک کے سلسلے میں سر پھٹول کر لیا کرتے تھے۔ ویسے رحمان بھائی محلے کی نظروں میں کوئی اچھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی کی زندگی ہی میں اپنی سالی سے جوڑ توڑ کر لیا تھا۔ اس یتیم سالی کا سوائے اس بہن کے اور کوئی مرا جیتا نہ تھا۔ بہن کے ہاں پڑی تھی۔ اس کے بچے پالتی۔ بس دودھ پلانے کی کسر تھی باقی سارا گو موت دہی کرتی تھی۔ اور پھر کسی ناک چڑھی نے اُسے بہن کے بچہ کے منہ میں ایک دن چھاتی دیتے دیکھ لیا۔ بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور پتہ چلا کہ بچوں میں آدھے بالکل خالہ کی صورت پر ہیں۔ گھر میں رحمان کی دلہن چاہے بہن کی درگت بناتی ہوں پر کبھی پنچوں میں اقرار نہ کیا۔ یہی کہا کرتی تھیں

"جو کنواری کو کہے گا اس کے دیدے گھٹنوں کے آگے آئے گا"

ہاں بڑکی تلاش میں ہر دم سوکھا کرتی تھیں پر اس کیڑوں بھرے کباب کو کہاں جڑتا۔ ایک آنکھ میں یہ بڑی کوڑی سی پھلی تھی پھر بھی اک ذرا چھوٹا تھا۔ کولہا دبا کر چلتی تھی۔

سارے محلے سے ایک عجیب طرح کا بائیکاٹ ہو چکا تھا لوگ رحمان سے کام پڑتا تو دھونس جما کر کہہ دیتے۔ "محلے میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ رحمان بھائی اسی کو اپنی عزت افزائی سمجھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ رحمان بھائی کی کھڑکی میں طویل گالیاں دیا کرتی تھیں۔ کیونکہ باقی محلے کے لوگ ابا سے ڈرتے تھے مجسٹریٹ سے کون بیر مول لے۔

اس دن پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ ہماری اکلوتی سگی پھوپھی بادشاہی خانم ہیں اور یہ لمبی لمبی گالیاں ہمارے خاندان کو دی جا رہی ہیں۔

اماں کا چہرہ فق تھا اور وہ اندر کمرے میں سہمی بیٹھی تھیں جیسے بچو پھوپھی کی آواز ان پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے گی چھٹے چھماہے اسی طرح بادشاہی خانم رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر بنکاریں۔ ابا میاں ان سے ذرا سی آڑ لے کر مزے سے آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھتے رہتے اور موقع محل پر کسی لڑکے کے ذریعے کوئی ایسی بات جواب میں کہہ دیتے کہ پھوپھی بادشاہی پھر شتابیاں چھوڑنے لگتیں۔ ہم لوگ سب کھیل کود پڑھنا لکھنا چھوڑ کر صحن میں گچھا بنا کر کھڑے ہو جاتے اور ڈٹ کر اپنی پیاری پھوپھی کے کوسنے سنا کرتے جس کھڑکی

یں وہ بیٹھتی تھیں وہ ان کے طول طویل جسم سے یہ لمبا لمبا بھری ہوئی تھی
ابا میاں سے اتنی ہم شکل تھیں کہ جیسے ابا میاں مونچھیں اتار کر دوپٹہ اوڑھ
کر بیٹھ گئے ہوں۔ اور باوجود کوسنے اور گالیاں سننے کے ہم لوگ
بڑے اطمینان سے انہیں تکا کرتے تھے۔

ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چار انگل چوڑی کلائی، بشیر کا
سا کلہ، سفید نگلا بال بڑا سا دہانہ، بڑے بڑے دانت، بھاری بھرکم
سی ٹھوڑی اور آواز تو ماشاء اللہ ابا میاں سے ایک ہی سُر
نیچی ہو گی۔

پھوپھی بادشاہی ہمیشہ سفید کپڑے پہنا کرتی تھیں۔ جس دن
پھوپھا مسعود علی نے مہترانی کے سنگ کلیلیں شروع کیں۔ پھوپھی نے
بیٹھے سے ساری چوڑیاں چھناچھن توڑ ڈالیں۔ رنگا دوپٹہ اُتار دیا۔
اور اس دن سے وہ انہیں مرحوم یا مرنیوالا کہا کرتی تھیں۔ مہترانی
کو چھونے کے بعد انہوں نے وہ ہاتھ پیر اپنے جسم کو نہ لگنے دیئے۔

یہ سانحہ خاصی جوانی میں ہوا تھا اور وہ جب سے رنڈاپا جھیل رہی
تھیں۔ ہمارے پھوپھا ہماری اماں کے چچا بھی تھے۔ ویسے تو نہ جانے
کیا گھپلا تھا۔ میرے ابا میری اماں کے چچا لگتے تھے اور شادی سے
پہلے وہ جب پھوڈی سی تھیں تو میرے ابا کو دیکھ کر ان کا پیشاب نکل

جاتا تھا اور جب انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ ان کی منگنی اسی بھیانک دیو سے ہونے والی ہے تو انہوں نے اپنی دادی یعنی ابّا کی پھوپھی کی پٹاری سے افیون چرا کر کھالی تھی۔ افیون زیادہ نہیں تھی اور وہ کچھ دن لوٹ پوٹ کر اچھی ہوگئیں۔ ان دنوں ابّا علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کی بیماری کی خبر سن کر امتحان چھوڑ کر بھاگے۔ بڑی مشکل سے ہمارے نانا جو ابّا کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے۔ اور بزرگ دوست بھی، انھوں نے سمجھا بجھا کر واپس امتحان دینے بھیجا تھا۔ جتنی دیر وہ رہے بھوکے پیاسے ٹہلتے رہے۔ اُدھ کھلی آنکھوں سے میری اماں نے ان کا چوڑا چکلا سایہ پردے کے پیچھے بیقراری سے تڑپتے دیکھا۔

"امراؤ بھائی اگر انھیں کچھ ہوگیا.... تو...."

دیو کی آواز لرز رہی تھی۔ نانا میاں خوب ہنسے۔

"نہیں برادر خاطر جمع رکھو کچھ نہ ہوگا۔"

اس وقت میری ننّی سی معصوم ماں ایک دم عورت بن گئی تھی۔ اس کے دل سے ایک دم دیو زاد انسان کا خوف نکل گیا۔ جبھی تو میری پھوپھی بادشاہی کہتی تھیں

"میری اماں بہادر گرنی ہے اور اس کا تو میرے بھائی سے شادی سے پہلے تعلق ہوکر پیٹ گرا تھا۔"

میری اماں اپنے جوان بچوں کے سامنے جب یہ گالیاں سنتیں تو ایسی بسور بسور کر روتیں کہ انہیں ان کی مار فراموش ہو جاتی اور پیار آنے لگتا۔ مگر ابا میاں کی آنکھوں میں پریاں ناچنے لگتیں۔ وہ بڑے پیار سے ننھے بھائی کے ذریعے کہلواتے۔

"کیوں بی پھپی آج کیا کھایا ہے؟"

"تیرے ابا کا کلیجہ۔" اس بے تکے جواب سے پھوپھی جل کر مرنڈا ہو جاتیں۔

ابا پھر جواب دلواتے۔

"ارے پھوپھی جب ہی منہ میں بواسیر ہو گئی ہے جلاب لو جلاب لو۔"

اور وہ میرے جوان بھائی کی پھیچاتی لاشوں پر کوؤں چیلوں کو دعوت دینے لگتیں۔ ان کی دلہن کو جو نہ جانے بیچاری اس وقت کہاں بیٹھی اپنے خیالی دولہا کے عشق میں لرز رہی ہوگی۔ رنڈاپے کی دعائیں دیتیں اور میری اماں کانوں میں انگلیاں دے کر بڑبڑاتیں۔ "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔"

پھر ابا اکساتے اور ننھے بھائی پوچھتے۔

"پھوپھی بادشاہی مہترانی پھوپھی کا مزاج تو اچھا ہے۔ اور میں

نا ہے کہ کہیں پھوپھی کھڑکی سے پھاند نہ پڑیں

" ارے جا سنپولئے، میرے منہ نہ لگ، نہیں تو جوتی سے منہ مسل
گی۔ یہ بڈھا اندر بیٹھا کیا لونڈوں کو سکھا رہا ہے۔ مغل بچہ ہے تو سامنے
ے بات کرے۔"

" رحمان بھائی اے رحمان بھائی۔ یہ بورانی کتیا کو سنکھیا کیوں نہیں
انتے ؟ "

ابا کے سکھانے پر ننھے بھائی ڈرتے ہوئے بولتے حالانکہ
ں ڈرنے کی کوئی ضرورت تو نہ تھی۔ کیونکہ سب جانتے تھے کہ آواز
کی ہے مگر الفاظ ابا میاں کے ہیں۔ لہذا گنا و ننھے بھائی کی جان
ہیں مگر پھر بھی بالکل ابا کی شکل کی پھوپھی کی شان میں کچھ کہتے انہیں
ہے آپا نتے تھے۔

کتنا زمین و آسمان کا فرق تھا ہماری ددھیال اور ننھیال
ل میں۔ ننھیال حکیموں کی گلی میں اور ددھیال گاڑی والوں کے
ے میں۔ ننھیال والے سلیم چشتی کے خاندان سے تھے جنہیں
ں بادشاہ نے مرشد کا مرتبہ دے کر نجات کا راستہ پہچانا ——
ہندوستان میں رس بسے عرصہ گزر چکا تھا۔ رنگتیں
ولا چکی تھیں۔ نقوش نرم پڑ چکے تھے [illegible] سے ہو گئے تھے۔

ددھیال والے باہر سے سب سے آخری کھیپ آنے والوں سے تھے۔ ذہنی طور پر ابھی تک گھوڑوں پر سوار منزلیں مار رہے تھے خون میں لاوا دہک رہا تھا۔ کھرے کھرے تلوار جیسے نقوش، لال فرنگ جیسے منہ گرگلوں جیسی قد و قامت۔ شیروں جیسی گرجدار آوازیں۔ شہتیر جیسے ہاتھ پاؤں۔

اور ننھیال والے نازک ہاتھ پیروں والے شاعرانہ طبیعت کے۔ دھیمی آوازمیں بولنے چالنے کے عادی۔ زیادہ تر حکیم، عالم اور مولوی تھے جب ہی محلے کا نام حکیموں کی گلی پڑ گیا تھا۔ کچھ کاروبار میں بھی لگ گئے تھے۔

شال باف، زردوز اور عطار وغیرہ بن چکے تھے حالانکہ یہ ددھیال والے ایسے لوگوں کو کنجڑے قصائی ہی کہا کرتے تھے چونکہ وہ خود زیادہ تر فوج میں تھے۔ ویسے مار دھاڑ کا شوق ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ کشتی، پہلوانی، تیراکی میں نام پیدا کرنا، پنجہ لڑانا، تلوار اور پٹے کے ہاتھ دکھانا اور جو تیزی کو جو میری ننھیال کے مرغوب ترین کھیل تھے، ہیجڑوں کے کھیل سمجھنا۔

کہتے ہیں جب آتش فشاں پہاڑ پھٹتا ہے تو لاوا وادی کی گود میں اتر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ددھیال والے ننھیال

ں کی طرف خود بخود کھنچ کر آ گئے۔ یہ سلسلہ کب اور کس نے شروع کیا۔
ہجرے میں لکھا ہے مگر مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میرے دادا ہندوستان
پیدا نہیں ہوئے تھے۔ دادیاں بھی اسی خاندان سے تھیں۔ مگر ایک
ی سی بہن بن بیاہی تھی نہ جانے کیونکر وہ شیخوں میں بیاہ دی گئی شاید
ں اماں کے دادا نے میرے دادا پر کوئی جادو کر دیا تھا کہ انھوں نے
ہن بقول پھوپھی بادشاہی کنجڑوں قصائیوں میں دے دی۔ اپنے
وم، شوہر کو گالیاں دیتے وقت وہ ہمیشہ اپنے باپ کو قبر میں
ں نہ ملنے کی بددعائیں دیا کرتیں، جنہوں نے چغتائی خاندان کی مٹی
د کر دی۔

میری پھوپھی کے تین بھائی تھے۔ میرے تایا۔ میرے ابا
ں اور میرے چچا بڑے دو ان سے بڑے تھے اور چچا سب سے
ٹے تھے۔ تین بھائیوں کی ایک لاڈلی بہن ہمیشہ کی نخریلی اور
۔ مزاج تھیں، وہ ہمیشہ تینوں پر رعب جماتیں اور لاڈ کرواتیں بالکل
وں کی طرح پلیں، شہسواری، تیراندازی اور تلوار چلانے کی
خاصی مشق تھی۔ ویسے پھل پھال کر ڈھیر معلوم ہوتی تھیں۔ مگر
والوں کی طرح سینہ تان کر چلتی تھیں۔ سینہ تھا بھی بہادر عورتوں
ا۔

ابا مذاق میں اماں کو چھیڑا کرتے۔
بیگم بادشاہی سے کشتی لڑو گی ؟"
" اوئی توبہ میری، عالم فاضل باپ کی بیٹی، میری اماں کانوں ہاتھ دھر کر کہتیں مگر وہ ننھے بھائی سے فوراً پھوپھی کو چیلنج بھجواتے
" پھوپھی ہماری اماں سے کشتی لڑو گی ؟"
" ہاں، ہاں بلا اپنی اماں کو، آ جائے خصم ٹھونک کر اس الّو نہ بنا دوں تو مرزا کریم بیگ کی اولاد نہیں۔ باپ کا نطفہ ہے یا ماما زادی کو ....."
اور میری اماں اپنا لکھنؤ کا بڑے پائنچوں کا پاجامہ سمیٹ کر کونے میں دبک جاتیں۔
" پھوپھی بادشاہی، دادا میاں گنوار تھے نا۔ بڑے نانا جان انہیں آمد نامہ پڑھایا کرتے تھے۔ ہمارے پرنانا دادا جان۔ کبھی دادا جان کو کچھ پڑھا دیا ہو گا ابا میاں چھیڑنے کو بات بنا کر کہلواتے۔
" ارے وہ استنجا کا ڈھیلہ کیا میرے باوا کو پڑھاتا۔ جاہل کہیں کا۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلا تھا، یہ سلیم چشتی اور اکبر بادشاہ رشتے سے حساب لگایا جاتا۔ ہم لوگ یعنی چغتائی اکبر بادشاہ

خاندان سے تھے۔ جنہوں نے میری ننھیال کے سلسلے چشتی کو پیر و مرشد
کہا تھا۔ مگر کچھ پھپی کہتیں۔

- خاک پیر و مرشد کی دم! مجاور تھے مجاور۔ تینوں بھائی تھے مگر
تینوں سے لڑائی ہو چکی تھی اور وہ غصہ ہوتیں تو تینوں کی دھجیاں بکھیر دیتیں
بڑے بھائی بڑے اللہ والے تھے۔ انھیں حقارت سے فقیر
اور بھیک منگا کہتیں۔ ہمارے ابا گورنمنٹ سروس میں تھے انہیں
غدار اور انگریزوں کا غلام کہتیں۔ کیونکہ مغل شاہی انگریزوں نے ختم کر
ڈالی ورنہ آج مرحوم پتلی دال کھانے والے جلاہے یعنی میرے
پھوپھا کے بجائے وہ لال قلعہ میں زیب النساء کی طرح عرق گلاب
میں غسل فرما کر کسی ملک کے شہنشاہ کی ملکہ بنی بیٹھی ہوتیں۔ تیسرے
چچا بڑے دس نمبر کے بدمعاشوں میں سے تھے۔ اور سپاہی ڈرتا
ڈرتا مجسٹریٹ بھائی کے گھر ان کی حاضری لینے آیا کرتا تھا۔ انھوں نے
کئی قتل کیے تھے ڈاکے ڈالے تھے۔ شراب اور رنڈی بازی میں
اپنے آپ تھے۔ وہ انہیں ڈاکو کہا کرتی تھیں۔ جو ان کے کیریر
کو دیکھتے ہوئے قطعی [illegible] تھا۔

مگر جب وہ اپنے مرحوم شوہر سے غصہ ہوتیں تو کہا کرتیں۔
" منہ جلے نگوڑی ناہنی نہیں ہوں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن

ہوں۔ ان کو خبر ہو گئی تو دین دنیا کا نہ رہے گا۔ اور کچھ نہیں اگر چھوٹا
سن لے تو پل بھر میں انتڑیاں نکال کے ہاتھ میں تھما دے ڈاکو
ہے ڈاکو۔ اس سے بچ گیا تو منجھلا مجسٹریٹ تجھے جیل میں سڑوا دیگا
ساری عمر چکیاں پسوائے گا اور اس سے بھی بچ گیا تو بڑا تو اللہ
والا ہے تیری عاقبت خاک میں ملا دے گا۔

دیکھ مغل بچی ہوں۔ تیری اماں کی طرح شیخانی قصائی نہیں
ہوں ۔ مگر میرے پھوپھا اچھی طرح جانتے تھے کہ تینوں بھائی ان
ہی پر رسم کھاتے ہیں اور بیٹھے مسکراتے رہتے۔ میٹھی میٹھی
زہریلی مسکراہٹ جس کے ذریعے سے میرے ننھیال والے
ددھیال والوں کو برسوں سے جلا رہے ہیں۔

ہر عید بقر عید کو میرے ابا میاں بیٹوں کو لے کر عید گاہ
سے سیدھے پھوپھی اماں کے ہاں کوسنے اور گالیاں سننے جایا
کرتے تو وہ ذرا پردہ کر لیتیں اور کونے میں سے میری جادوگرنی
ماں اور ڈاکو ماموں کو کوسنے لگتیں۔ نوکر کو بلا کر سویاں بھجواتیں۔
مگر یہ کہتیں کہ پڑوسن نے بھیجی ہیں

ان میں زہر تو نہیں ملا ہوا ہے ؟ ابا چھیڑنے کو کہتے
اور پھر ساری ننھیال کے چیتھڑے بکھیرنے جاتے۔ سویاں کھا کر

ابّا عیدی دیتے جو فوراً زمین پر پھینک دیتیں کہ " اپنے سالوں کو دو وہی تمہاری روٹیوں پر پلے ہیں ۔ "

مگر ابّا چپ چاپ چلے آتے اور وہ جانتے تھے پھوپھی بادشاہی وہ روپے گھنٹوں آنکھوں سے لگا کر روتی رہیں گی بھتیجوں کو آڑ میں بلا کر عیدی دیتیں ۔

" حرامزادو ! اگر امّاں ابّا کو بتایا تو بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی "

امّاں ابّا کو معلوم تھا کہ لڑکوں کو کتنی عیدی ملی ۔ اگر کسی عید پر کسی وجہ سے ابّا نہ جا پاتے تو پیغام آتے ۔

" نصرت خانم بیوہ ہو گئیں چلو اچھا ہوا میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا ۔ "

بُرے بُرے پیغام شام تک آتے ہی رہتے اور پھر وہ خود رحمان بھائی کے کوٹھے پر سے گالیاں برسانے آجاتیں ۔

ایک دن عیدی سوّیاں کھاتے کھاتے کچھ گرمی سے جی ماش کرنے لگا ۔ ابّا میاں کو اُلٹی ہو گئی ۔

" لو بادشاہو تم کہا سنا معاف کرنا ۔ ہم چلے "

ابّا میاں نے کراہ کر آواز بنائی اور پھوپھی لشتم پشتم پردہ پھینک پھاتی کوٹھی نکل آئیں ۔

اباکو شرارت سے ہنستا دیکھ کر الٹے پاؤں کوستی لوٹ گئیں۔
"تم آگئیں بادشاہی تو ملک الموت بھی گھبرا کر بھاگ گئے ورنہ ہم تو آج ختم ہو جاتے۔" ابا نے کہا۔
نہ پوچھیے پھوپھی نے کتنے وزنی وزنی کوسنے دیئے۔ انھیں خطرے سے باہر دیکھ کر لوبلیں۔
"اللہ نے چاہا بجلی گرے گی۔ نالی میں گر کر دم توڑو گے کوئی میت کو کاندھا دینے والا نہ بچے گا۔"
اور ابا چڑانے کو انھیں دو روپے بھجواتے۔
"بھئی ہماری خاندانی ڈومنیاں گاؤ دے دیں تو انھیں بیل تو ملنی ہی چاہیئے۔"
اور پھوپھی بوکھلاہٹ میں کہہ جاتیں۔
"بیل دے اپنی اماں بہنیا کو۔" اور وہ فوراً اپنا منہ پیٹنے لگتیں۔ خود ہی کہتیں۔ "اے بادشاہی بندی تیرے منہ کو کالکھ لگے۔ اپنی میت آپ پیٹ رہی ہے۔"
پھوپھی کو اصل میں بھائی سے ہی بیر تھا بس ان کے نام پہ آگ لگ جاتی ویسے کہیں ابا کے بغیر اماں نظر آجاتیں تو گلے لگا کر پیار کرتیں۔

پیار سے پچھو پچھو کہتیں۔ "بچے تو اچھے ہیں۔" وہ یہ بالکل بھول جاتیں کہ یہ بچے اسی بدذات بھائی کے ہیں جسے ازل سے لیکر ابد تک کوستی رہیں گی۔ اماں ان کی بھتیجی بھی تو تھیں۔

بھئی کس قدر گھپلا تھا میری ددھیال ننھیال میں، ایک رشتے سے میں اپنی ماں کی بہن بھی لگتی تھی۔ اس طرح میرے ابا میرے دولہا بھائی بھی ہوتے تھے۔ میری ددھیال کو ننھیال والوں نے کیا کیا غم نہ دیئے۔ غضب تو جب ہوا جب میری پھوپھی کی بیٹی مسرت خانم ظفر ماموں کو دل دے بیٹھیں۔

ہوا یہ کہ میری اماں کی دادی یعنی ابا کی پھوپھی جب لب دم ہوئیں تو دونوں طرف کے لوگ تیمار داری کو پہنچے۔ میرے ماموں بھی اپنی دادی کو دیکھنے گئے۔ اور مسرت خانم بھی اپنی اماں کے ساتھ ان کی پھوپھی کو دیکھنے آئیں۔

بادشاہی پھوپھی کو کچھ ڈر خوف تو تھا نہیں۔ وہ جانتی تھیں میرے ننھیال والوں کی طرف سے انھوں نے اپنی اولاد کے دل میں اطمینان بخش حد تک نفرت بھر دی ہے۔ اور پھر سترہ برس کی مسرت خانم کا ابھی سن ہی کیا تھا۔ اماں کے کولھے سے لگ کر سوتی تھیں۔ دودھ پیتی ہی انھیں تو لگتی تھیں۔

پھر جب میرے ماموں نے اپنی کرنجی شربت بھری آنکھوں سے مسرت جہاں کے لچکدار سراپے کو دیکھا تو وہیں کی وہیں جسم کر رہ گئیں۔

دن بھر بڑے بوڑھے تیمارداری کر کے تھک ہار کے سو جاتے تو یہ فرمانبردار بچے سرہانے بیٹھے مریضہ کو کم ایک دوسرے پر زیادہ نگاہ رکھتے۔ جب مسرت جہاں برف میں ترکپڑا بڑھیا بی کے ماتھے پر بدلنے کو ہاتھ بڑھائیں تو ظفر ماموں کا ہاتھ وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔

دوسرے دن بڑی بی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ لرزتی کانپتی گاؤ تکیہ کے سہارے اُٹھ بیٹھیں۔ اُٹھتے ہی سارے خاندان کے ذمہ دار لوگوں کو طلب کیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو حکم ہوا کہ قاضی کو بلواؤ۔

لوگ پریشان کہ بڑھیا قاضی کو کیوں بلا رہی ہے کیا۔ آخری وقت سہاگ رچائے گی۔ کس کو دم مارنے کی ہمت تھی قاضی آیا۔

"دونوں کا نکاح پڑھا دو"

لوگ چکرائے کن دونوں کا، مگر ادھر مسرت جہاں پٹ سے بے ہوش ہو کر گریں۔ ادھر ظفر ماموں بوکھلا کر باہر چلے

چور پکڑے گئے نکاح ہو گیا۔ بادشاہی پھوپھی سناٹے میں رہ گئیں۔
حالانکہ کوئی خطرناک بات نہ ہوئی تھی۔ دونوں نے صرف ہاتھ پکڑے تھے۔ مگر بڑی بی کیلئے بس یہی حد تھی۔
اور پھر جو بادشاہی پھوپھی کو دورہ پڑا ہے تو بس گھوڑے اور تلوار کے بغیر انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے کھڑے کھڑے بیٹی داماد کو نکال دیا۔ مجبوراً ابا میاں، دولہا دلہن کو اپنے گھر لے گئے۔ اماں تو چاندی بھابی دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ بڑی دھوم دھام سے ولیمہ کیا۔
بادشاہی پھوپھی نے اس دن سے پھوپھی کا منہ نہیں دیکھا۔ بھائی سے پردہ کر لیا۔ میاں سے پہلے ہی ناچاقی تھی۔ دنیا سے منہ پھیر لیا اور ایک زہر تھا کہ ان کے دل و دماغ پر چڑھتا ہی گیا۔ زندگی سانپ کے پھن کی طرح ڈسنے لگی۔
"بڑھیا نے پوتے کے لئے میری بچی کو پھنسانے کے لئے مکر گانٹھا تھا۔"
وہ برابر یہی کہے جاتیں کیونکہ واقعی وہ اس کے بعد بیس سال تک اور جیں۔ ہوں جانے ٹھیک ہی کہتی ہو پھوپھی۔
مرتے دم تک بہن بھائی میں میل نہ ہوا۔ جب ابا میاں

پر فالج کا چوتھا حملہ ہوا اور بالکل ہی وقت آ گیا تو انہوں نے پھوپھی بادشاہی کو کہلا بھیجا۔

"بادشاہی خانم ہمارا آخری وقت ہے دل کا ارمان پورا کرنا ہو تو آ جاؤ۔"

نہ جانے اس پیغام میں کیا تیر چھپے تھے۔ بھیا نے پھینکے اور بہنیا کے دل میں اتر گئے۔ بلبلاتی، چھاتی کوٹتی، سفید پہاڑ کی طرح بھونچال لاتی ہوئی بادشاہی خانم اس ڈیوڑھی پر اتریں۔ جہاں اب تک انہوں نے قدم نہیں رکھا تھا۔

"لو بادشاہی تمہاری دعا پوری ہو رہی ہے۔" ابا میاں تکلیف میں بھی مسکرا رہے تھے ان کی آنکھیں اب بھی جوان تھیں۔

پھوپھی بادشاہی باوجود بالوں کے [illegible] رہی تھیں۔ جو بچپن میں بھائیوں سے مچل مچل کر بات منوا لیا کرتی تھیں۔ ان کی شیر جیسی خرانٹ آنکھیں ایک [illegible] معصوم آنکھوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے آنسو ان کی سنگِ مرمر کی چٹان جیسے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"ہمیں کوسو، پھوبی۔" ابا نے پیار سے کہا۔ "میری

اماں نے سسکتے ہوئے بادشاہی خانم سے کوسنے کی بھیک مانگی۔

"یااللہ.... یااللہ...." انہوں نے گرجنا چاہا مگر کانپ کر رہ گئیں۔ "یااللہ..... یااللہ.... میری عمر بھیا کو دیدے یا مولا.... اپنے رسولؐ کا صدقہ...."

وہ اس بچے کی طرح جھنجھلا کر رو پڑیں جسے سبق یاد نہ ہو۔

سب کے منہ فق ہوگئے اماں کے پیروں کا دم نکل گیا۔ یا خدا آج بجھو پھوپھی کے منہ سے بھائی کے لئے ایک کوسنا نہ نکلا۔

صرف ابا میاں مسکرا رہے تھے جیسے ان کے کوسنے سن کر مسکرا دیا کرتے تھے

سچ ہے بہن کے کوسنے بھائی کو نہیں لگتے۔ وہ ماں کے دودھ میں ڈوبے ہوتے ہیں۔

●

جہنم کی پیاس

میرے پیدا ہونے کی کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی۔ مجھ سے
ے پانچ بھائی اور تین بہنیں وارد ہو چکی تھیں۔ ماں بچوں سے دب چکی تھیں
پانچوں تک تو وہ ماں بننے کی خوشیاں مناتی رہیں پر جب بچوں
گھر ہی دیکھ لیا تو وہ ماں بننے کو سزا سمجھ کر جھیلنے لگیں۔

میرے ابا کو بچہ بازی کی لت تھی۔ خواہ وہ مرغی کے چوزے
یا کتے کے پلّے، وہ انھیں بڑے انہماک سے پالتے جوں ہی
ے انڈا کھٹک کر باہر آتے۔ ابا میاں کی کوشش ہوتی کہ جلد سے
انھیں علیحدہ کر دیں تاکہ مرغی کڑکی جھاڑ کر انڈے دینے لگے۔

اسی طرح جونہی بچہ پیدا ہوتا وہ آگرے سے ایک دودھار کو بلوا کر بچہ اس سے لگا دیتے اور اماں نئے جیو کی تیاری میں الجھ جاتیں۔

میری انا کا نام ٹیکو تھا۔ سانولی سلونی کمسن لونڈیا سی تھی۔ پہلوٹھی کا بچہ جن کر غریبی سے مقابلہ کرنے، اسے چاول کی پیچ پر چھوڑ کر مجھے اپنا خون چسانے آنا پڑا تھا۔ دو چار روز اپنے بچے کی یاد میں روئی پیٹی پھر ذرا مرغن راتب ملا۔ کچھ دھمکیاں ملیں تو ہار جھک مار کر ڈیوٹی پر جٹ گئی۔

جب کبھی میں اپنی انا ٹیکو کا خیال کرتی ہوں تو میرا وجود شرم سے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ اِدھر میں پھول پھول کر کپا ہوتی جا رہی تھی۔ اُدھر اس کا پہلوٹھی کا پوت رنجھ رنجھ کر موت کی طرف رینگ رہا تھا۔

جب بچھ مہینے کے بعد وہ آگرے گئی۔ تو اس کے کلیجے کا ٹکڑا سوکھ کر ہڈیوں کا ہار بن چکا تھا۔ یہ مٹکا سا پیٹ کھیچی سے ہاتھ پیر، اسے سوکھے کی بیماری بڑی تیزی سے نگل رہی تھی۔ جوئیں اس کے جسم پر جونکوں کی طرح لپٹی، رہا سہا خون چوس رہی تھیں۔ پلکوں تک میں لیکھیں بھر گئی تھیں۔ میں ٹھمک ٹھمک کر گھٹنوں چلنے لگی تھی۔ اور وہ چھپکلی کے پیٹ کی طرح زرد مردار یسلی کے مرض میں مبتلا، کھری کھاٹ پر پڑا سانس کی دھونکنی چلایا کرتا تھا۔ اس کے جبڑے

ھ کھینچنے کی طاقت کھو چکے تھے۔
جب انّا نے اس کے منہ میں دودھ دیا تو وہ اناڑیوں کی
ے اس کا منہ تکنے لگا اور میں نے رشک و حسد کی آگ میں بھسم ہو
سے کھسوٹ کر دور پھینک دیا اور خود جیٹ گئی۔
انّا سال میں دو بار اپنے گھر جاتی تھی۔ اس کے ساتھ مغلانی
مردار وغیرہ بھی مزید احتیاط کیلئے جاتے تھے۔ میں مغلانی کے ساتھ
ٹ کلاس میں رکھی جاتی تھی۔ اور اسٹیشنوں پر انّا بھاگم بھاگ مجھے
ھ پلانے آیا کرتی تھی۔ کوئی واڑے میں جب لاؤ لشکر پہنچتا تو
ہنگامہ برپا ہو جاتا۔
جمعدار کے پاک صاف صحن میں بانس کی نئی کھاٹیں خرید
الی جاتیں۔ ایک پر مغلانی بی اپنا صاف ستھرا بستر بچھا کر ناک سکیڑ
ر جاتیں۔ نیا چھینٹ کا لہنگا پہنے انّا اِدھر اُدھر منڈلاتی پھرتی۔
ی کوشش اپنی اہمیت جتانے کی کرتی، مغلانی بی بڑی صفائی
ہ کاٹ جاتیں اور رات کو اس ڈر سے کہ کہیں مردار اپنے خصم
نہ مل بیٹھے۔ اس کی کھاٹ پٹی سے [illegible] دیتیں۔ باہر کنڈی
اکر دار وغیرہ بھی ڈٹ جاتے۔ اگر پھر کہیں گابھن ہو بیٹھی تو دودھ زہر
ئے گا اور میں نگوڑی پھڑک جاؤں گی۔"

رات کو انا کا شوہر دارو پی کر آتا اور بہت دند مچاتا۔ اس کی آ
سن کر انا گرم کتیا کی طرح بلبلا اٹھتی۔ مگر مغلانی کی مغلظات سن کر ا
سسکیاں بھر کے دبک رہتی۔ شوہر خوب شور مچاتا، لوگ باگ آ
ہو جاتے۔ وہ ایک پل کو انا کی صورت دیکھنے کیلئے گڑگڑاتا۔
انیس برس کا لونڈا ہی تو تھا۔ بڑی منتوں، سماجتوں سے دار
جی اُسے اندر لاتے۔

"رانی۔" وہ بھینسے کی طرح پھنکارتا۔

"سوامی۔" انا اس کے پیروں کو چھونے بڑھتی

وہیں سب کے سامنے وہ بولائے کتوں کی طرح ایک دوسرے
کو بھنبھوڑنے لگتے۔ داروغہ جی، بی مغلانی اور آٹھ روپے
کپڑے درمیان میں کود پڑتے۔ شوہر کو اس کے بھائی بند گھسیٹ
لے جاتے۔ اور ٹیکو بے وقت ہی مجھے دودھ پلانے پر بضد ہو جا
مگر دودھ میں جیسے زہر گھل جاتا۔ اور میں واویلا مچانے لگتی۔
کی گاڑی سے شتم پشتم واپس لوٹ آتے۔

دوسری دفعہ جب انا گھر گئی تو میں پیروں چلنے لگی تھی۔ ا
کا بچہ تنوا بیٹھنے لگا تھا۔ سوکھے کے ساتھ ہوکے کی بیماری
لگ گئی تھی۔ بس کھائے چلا جاتا تھا۔ خاک، مٹی، کوڑا کرکٹ

ں کی بیٹ، پھل، ترکاری کے چھلکے غرض جو ہاتھ آجاتا سوکھی
انگلیوں میں دبوچ کر منہ میں گھسیڑ لیتا۔ اسی وجہ سے اسے
ں دست آتے رہتے تھے۔ اس کے چاروں طرف
لی غلاظت کی ایک جھیل سی بن جاتی۔ جس کے کناروں
وں کی گوٹ بنی رہتی۔

یچ میں وہ ایک سنسان بنجر جزیرے کی طرح ڈٹا بسورا۔
۔ المونیم کا ایک ٹیڑھا کبڑا پیالہ اس کی کل جمع پونجی تھی۔ اس
سے اس کی کربناک زندگی کی جملہ رعنائیاں وابستہ
۔ یہ پیالہ اس کی ماں کا تھا۔

اور یہی اس کا ان داتا۔ اگر گھڑی بھر کو پیالہ نظروں
جھل ہو جاتا تو وہ یتیموں کی طرح ہائے وویلا مچانے لگتا۔
کلیجے سے لگائے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ جب
بھوک لگتی جو ہر وقت ہی لگی رہتی تھی۔ تو وہ دونوں ہاتھوں
لہ بجاتا۔ کبھی بندر کی طرح زمین پر گھستا۔ فقیر کی طرح
ہ دکھا کر اس میں کھانا ڈالنے کی تلقین کرتا۔ کتنا
دہ، ازلی بھوک قائم رہتی۔ کیونکہ معدہ اور آنتیں ڈھلان
ی طرح تھیں۔ خوراک نہایت تیزی سے بھاگتی دوڑتی

اس کے پیٹ میں سے چھوتی نکل جاتی اور وہ پھر خالی کا خالی رہ جاتا
یہ پیالہ اس کا کھلونا بھی تھا، ہمدم و دمساز بھی، گھنٹوں بیٹھا اُسے
سونگھے سوکھے ہاتھوں سے ٹٹولا کرتا، جیسے بچے بسکٹ چباتے
ہیں۔ ایسے دودھ کے ننھے ننھے دانتوں سے اس کے کنارے
چبایا کرتا۔ پھر وہیں غلاظت کی جھیل میں کٹورے پر منہ رکھ کر سو جاتا
ٹیکو کو دیکھ کر وہ بری طرح سہم گیا کہ کہیں وہ اس کا پیالہ تو
نہیں چھیننے آگئی ہے۔ ذرا بھی خون نے جوش نہ مارا اور ٹیکو کا خون
اب اس کے جسم میں رہا بھی نہ تھا۔ کب کا جھیل میں بہہ چکا تھا
ٹیکو کو بھی اس پر ممتا نہ آئی بلکہ شاید اس کے وجود سے
شرم اور گھن آئی ہوگی۔ میں سفید ولائیتی جوتیاں پہنے سارے صحن میں
پٹر پٹر بھاگتی پھرتی۔ محلے ٹولے کی عورتیں یہ عجوبۂ روزگار دیکھنے جوق
در جوق آرہی تھیں۔ اور ٹیکو حق ملکیت جتانے کیلئے بار بار شلوکے کے
بٹن کھول کر مجھے لبھا رہی تھی۔ اس کا جسم میری سب سے بڑی
کمزوری تھا۔

کبھی بھولے سے بھی اس کے شلوکے کا بٹن کھل جاتا تو
میں اس پر ٹوٹ پڑتی۔ وہ مجھے چڑانے کیلئے جسم کھولتی اور جب
میں ٹھمک کر آتی تو وہ شرارت سے اوندھی ہو جاتی اور میں بلک بلک

کر اس کے نیچے گھسنے کی کوشش کرتی۔ وہ یہ تماشے لوگوں کو دکھاتی، پھر مجھے یکلبے سے لگا کر چومنے لگتی، دور اس کا بچہ بھیل کے بچوں بیچ بیٹھا لوہے کے چنے چبایا کرتا۔

رات کو حسبِ معمول اس کے شوہر نے دنگا مچایا خوب سی دارو چڑھا کر مستانے سانڈ کی طرح ڈکرانے لگا۔ خوب جی بھر کے گالیاں دیں ۔ اس نے میرے ابا میاں تک کو نہ چھوڑا۔ انہیں ٹیکو کا یار بنا ڈالا۔ جب کسی پر بھی بس نہ چلا تو اپنی ماں کو لاتیں ماریں اور باپ کے سر پر لٹھ جما دیا۔

داروغہ جی نے فوراً ابا میاں کے دوست تھانیدار صاحب کو اطلاع دی۔ وہ جھٹ دو کانسٹیبل لے کر موقع واردات پر پہنچے۔ اور شوہر نامدار کو دنگا فساد برپا کرنے کی پاداش میں پکڑ کر لے گئے وہاں اس کی ایسی تاجپوشی ہوئی کہ بیوی کا عشق ناک کے راستے نکل گیا۔ ادھر ٹیکو گھگھیا رہی تھی۔ رو رہی تھی اور اس کے ساتھ میں بھی ہلکان ہو رہی تھی۔ مغلانی بی درود پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی۔ اور نتوا پیالہ پیٹ رہا تھا، جیسے وہ طبلِ جنگ ہو۔

میں کوئی ڈیڑھ برس کی تھی۔ اماں نئے جیو کو جنم دینے کے لئے بھری بیٹھی تھیں۔ اب کے چھ ماہی پر ٹیکو نے گھر بسانے

کی بات سنی ان سنی کر دی تھی وہاں اس کے لئے سوائے کوفت کے اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ گھر جانے کتراتی تھی۔ پورے دو سال کی عمر میں میرا دودھ چھوٹ جائے تو پھر انّا کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

کچھ دن سے انّا بے حد چونچال ہو گئی تھی، بات بات پر ہنستی کھلکھلاتی، راہ چلتوں کو چھیڑتی، مجھے لئے لئے گھومتی، کبھی باورچی سے ٹھٹھول ہو رہی ہے کبھی دھوبن سے الجھ رہی ہے کہ للی کے کپڑے ٹھیک سے نہیں دھوئے۔

مگر میں دن بدن چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ راتوں کو گلا پھاڑ پھاڑ کر روتی اس کی بوٹیاں چباتی۔ ہر وقت اس کے شلوکے کے گرد منڈلاتی رہتی۔ دوپہر کو عموماً بھوسے والی کوٹھری میں ٹھنڈ ہوا کرتی۔ وہ اپنی اوڑھنی بچھا کر مجھے اس پر سُلا دیتی اور خود بیٹھے بیٹھے سروں میں کنگھیاں الاپتی رہتی، شاید بھوسے کا کوئی تنکا چبھ گیا یا میری چھٹی حس نے جاگ کر مجھے جگا دیا۔

اگر کوئی کتا بلی کھانے کے خوان پر جٹا نظر آئے تو انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ وہی خاکسار کی ہوئی ہوگی۔ میری لاڈلی انّا کے شلوکے کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور داروغہ جی ....

میری چیخوں کی آواز سن کر سارے نوکر دوڑ پڑے شاید

گئی۔

میں نے لمحہ بھر کیلئے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ یا خدا وہ مجبور لمحہ، وہ اس کے شلوکے کی بھولی بسری مہک، جیسے میں اماں کے پیٹ میں سو رہی ہوں۔ وہ مجھے گائے کی طرح چاٹ رہی تھی۔ دکھاوے کو میں کسمسا رہی تھی۔ مگر میری ساری طاقت اس کی گود میں پگھل چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ ایک دم اس نے اپنے شلوکے کے بٹن کھول دیئے۔

"للی دودھ پیئے گی ۔ ؟"

اس نے میرے منہ میں دودھ ٹھونس دیا۔

جم غفیر جو مجھے گھیرے میں لئے تماشہ دیکھ رہا تھا، قہقہے مارنے لگا۔ میں نے اسے زور کا دھکا دیا اور سرپٹ بھاگی۔

"بی بی جی ۔ للی دودھ نہ پیتی ۔"

اس نے اماں سے شکایت کی، اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ میں نے دودھ پینے سے انکار کر دیا ہے۔

میں غسل خانے میں چھپ کر خوب روئی، ٹیکو نے بھرے مجمع میں مجھے ذلیل کر کے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا تھا۔ سب نے مجھے اتنا چھیڑا کہ سسک سسک کر دعائیں مانگنے لگی۔

"اللہ ٹیکو مر جائے، مر جائے، ٹیکو اماں تو مر جائے، ہائے ٹیکو اماں"، ٹیکو میری چڑ بن گئی۔

مگر ٹیکو نہیں مری، وہ سال چھٹے مہینے میرے لئے الموسیم کے میلے میں سے چنے، مرمرے، شکر کے کھلونے، بھوندی، مٹی کی گجریاں اور ہاتھی گھوڑے لایا کرتی۔ وہ میری رگ پہچان گئی تھی سب چھیڑتے، اس لئے اکیلے میں دیا کرتی، پھر بڑی رازداری سے پوچھتی — "للّی دودھ پیئے گی۔؟"

میں روٹھ جاتی تو وہ ہنستے ہنستے بےحال ہو جاتی۔ تب ہولے ہولے مجھے ابا اور اماں کی باتوں سے پتہ چلا کہ بغیر دائی کی مدد کے اسے داروغہ جی کے تحفے سے نجات مل گئی۔ میاں نے ایک نٹنی ڈال رکھی تھی۔ ٹیکو بال بچّہ بھی نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ اس لئے اُسے مار کر نکال دیا۔

ٹیکو نے ننوا کو بہت رجھانے کی کوشش کی۔ اسے دودھ بھی دینا چاہا۔ مگر عورت کی چھاتیاں اس کیلئے اجنبی تھیں۔ وہ اپنا پیالہ بجاتا رہا۔ اور پھر اس پر منہ رکھ کر سو گیا۔ اور ایسا سویا کہ پھر جاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

ٹیکو اس پیالے سے سر پھوڑ پھوڑ کر روتی رہی، بین

کرتی رہی سسکتی رہی۔ یہ وہی زہر میں بجھا ہوا پیالہ تھا جس میں وہ میرے لئے کھیلیں بتاشے لایا کرتی تھی جس سے مجھے شدید گھن آتی تھی۔ جیسے ننوا کے مردہ نیلے ہونٹ اب بھی اس کے کناروں پر رینگ رہے ہوں۔

پھر کئی سال کیلئے ٹیکو غائب ہوگئی۔ اب مجھے اس سے چڑ بھی آنا بند ہوگئی۔ اس بات پر بھی شرم نہیں آتی تھی کہ میں نے کولن کا دودھ پیا تھا۔ کولن جس نے مجھے دودھ پلانے کے جرم میں اپنی زندگی کا سب کچھ ہار دیا تھا۔ کولن جو میری ماں تھی۔

پھر وہی چلچلاتی دھوپ بھری دوپہر تھی کہ گلی میں لونڈوں کا غل سنائی دیا۔ بادلے کتوں سے پیچھا چھڑانے کیلئے گرتی پڑتی دروازے دھڑ دھڑاتی ایک جھرکٹ سی بڑھیا گھر میں داخل ہوئی۔

"رام کسن کھڑے ہمرے دوار ہم لجا سے جھکی جائیں۔"

اس نے بیچ صحن میں ہلکا سا گھونگھٹ کاڑھ کر تھرکنا شروع کر دیا۔

میں نے کتنی کہانیاں لکھیں، ہنستی کھل کھلاتی، روتی بسورتی اور کاٹتی جھنجھوڑتی، انھیں لکھتے وقت ہنسی بھی ہوں اور روئی بھی، اپنا خون بھی کھولایا ہے مگر ٹیکو ماں کا ذکر لکھتے وقت جو کرب اور جو جھلاہٹ میں محسوس کر رہی ہوں۔ اسے لکھتے ہوئے میرا قلم

دم چھوڑ دیتا ہے۔ چاہتی ہوں کہ وہ ٹیلسوں کے بگولے جو میرے دماغ میں اُٹھ رہے ہیں۔ انھیں بانٹ کر ذرا اس بوجھ کو ہلکا کر دوں جو ہمیشہ ٹیکو کے تصور سے میرا دم گھوٹنے لگتا ہے مگر نہیں یہ میرے امکان میں نہیں۔

سب ہنس رہے تھے، وہ پاگلوں کی طرح ناچ رہی تھی اس کا دودھ میری رگوں میں لاوا بن کر کھول رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھی سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ ہمیشہ وہ مجھے دیکھ کر بہہ جایا کرتی تھی آنکھوں میں مٹھاس بھر جاتی، ممتا سے جسم نڈھال ہو جاتا۔ "میری چڑیا۔" کہہ کر وہ میری طرف لپکتی اور میں چڑ کر بھاگا کرتی۔ مگر اس دن اس کی آنکھوں میں زہر میں ڈوبی اجنبیت کے سوا کچھ نہ تھا۔ لال لال آنکھوں میں ممتا کی چتا دہک رہی تھی۔

اس کا گریبان ناف تک چاک تھا۔ نرم گرم سانولے سینے کے بجائے لیترے جھول رہے تھے۔ "للی دودھ نہ پیئے گی؟" اس نے پوچھا۔ اس کی بغل میں وہی المونیم کا پیالہ تھا جس کے کناروں پر ننوا کے دانتوں کے نشان تھے اور جس میں وہ میرے لئے شکر کے کھلونے اور کھیلیں لایا کرتی۔ وہ پیالہ زہر سے چھلک رہا تھا

جے بوئی جہر بس پیالہ ہو میں نے ننوا کو دینا۔" پیالہ

بٹیا کو سانپ نے ڈس لیا۔ مگر سانپ کی جگہ اژدھا دیکھ کر لوگ بھونچکے رہ گئے۔ جب ہی میری انّا کا دودھ زہر ہو رہا تھا۔ دودھ کی بوتل ٹوٹ جائے یا اُسے کتا نجس کر دے تو کوڑے کے ڈبے میں پھینک دیتے ہیں۔

ٹیکو کو پہلی گاڑی سے آگرہ روانہ کر دیا گیا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر جوڑے، اماں کے قدموں پر ناک گھسی کہ اب وہ کسی کرم کی نہیں رہی۔ اُسے برادری میں کون گھسنے دے گا۔ اور پھر داروغہ جی کا تحفہ وہ کس کے منہ پر مارے گی، مگر شنوائی نہ ہوئی۔

میرے ابّا میاں جو مجسٹریٹ تھے، اپنے انصاف اور حق پرستی کیلئے مشہور تھے، سوچتی ہوں تو عقل کام نہیں کرتی کہ انہوں نے میری انّا کو کیسے نکال دیا؟۔

اس وقت وہ ساڑھے سترہ برس کی تھی، اس کی یاد میں میں نے اپنا کلیجہ نکال ڈالا۔ بہنیں مجھے کندھے سے لگائے رات رات بھر ٹہلتیں۔ مگر میری انّا کی یاد، اس کے شلوکے کی گرم گرم مہک ہوک بن کر اٹھتی رہی اور میں روتی رہی۔

یادداشت کا پہلا صفحہ الٹتی ہوں تو دھندلی دھندلی سی کوئی میلا میلا بھورا سا ہیولہ سل پر کوئی سفید سفید چیز پیس رہا ہے۔

شاید کھیر کیلئے چاول میں دور کہیں کوئی تھکی ہاری عورت بین کر رہی ہے
" ہائے میرا پوت ۔ "

میرے پاس تو منوا کا پیالہ بھی نہیں ہے جسے ٹٹول کر دل کو پھر اس نکالوں، بس میں روتی ہوں، کس کا پوت؟ کہاں چلا گیا؟ میں کچھ نہیں جانتی، بس روتی ہوں۔

میں اپنی منجھلی بہن کے سینے سے لگی صدیوں سے رو رہی ہوں۔ میں اس کے گریبان کے بٹن ٹٹولتی ہوں وہ شرم سے سرخ ہو کر مجھے دور پھینک دیتی ہے۔ میری اماں نظر بچا جاتی ہیں۔ میری باجی مجھے پھر اٹھا لیتی ہے۔

" نہیں، توبہ ۔ توبہ ۔ " وہ مجھے گریبان کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر تنبیہہ کرتی ہے۔

" نہیں ۔ توبہ ۔ " میں تائید کرتی ہوں۔ وہ ہنس پڑتی ہے۔ نظروں کے سامنے رنگ برنگے قمقموں کی قطاریں ہنستی گزر جاتی ہیں۔ باریک باریک روشن سلاخیں جال سا بنتی ہیں۔ میں بڑی ہو جاتی ہوں۔ اب حلق پھاڑ کر چلانے کے ساتھ ساتھ پیر بھی چلاتی ہوں۔ بھائیوں کی پلٹن کیساتھ باغوں اور کھیتوں پر دھاوے بھی مارتی ہوں۔ کبھی خربوزوں کی فالیز پر تو کبھی کچی کیریوں کی دھن میں گھنی

امریوں میں سرگرداں پھرتی ہوں۔ زندگی ایک شور ہے ایک سریلا ہنگامہ ہے جس کا حاصل نوح کھسوٹ اور گتھم گتھا، ایک چنگھاڑتے چیختے ماحول کا ایک پُرساز پرآواز حصہ میں بھی ہوں۔

خوب غسل مچتا ہے۔ برتن کھڑکھڑاتے ہیں ڈھول پٹتے ہیں۔ گھنگھرو بجتے ہیں اور باجی بیاہ کر چلی جاتی ہیں۔ میں پھر یتیم رہ جاتی ہوں، جنگلوں جنگلوں ویران گھوم رہی ہوں۔ روح اور جسم پر میل کی پپڑیاں جمتی جاتی ہیں۔ میں کسی کی لاڈلی نہیں، کسی کا بوجھ نہیں، میری داد اگیری سے لوگ عاجز ہیں۔ مرغیوں کو کھدیڑنا، کتوں کے ڈھیلے مارنا۔ ہر ذی روح کو تنگ کرنا میرا مقصدِ حیات ہے۔ اماں جب پکڑ پاتی ہیں جی بھر کے میری دھول جھاڑتی ہیں اور اپنے جی کا غبار۔

آج کل کے والدین تو بچوں کی تربیت پر کتابیں پڑھتے ہیں۔ میرے زمانے میں کتابوں سے بچوں کو ٹھوکا جاتا تھا۔ بشرطیکہ وہ نہایت موٹی ہوں، سب عاجز آکر کہتے ہیں

"یہ کولن کی لونڈیا ہے اس کا خون رنگ لا رہا ہے۔"

ہائے کولن مجھے بھینک کر کہاں چلی گئی ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ بس سانولی سلونی ٹھوڑی پر گودنے کے تین سیاہ نکتے مجھے یاد رہ گئے۔ اب بھی جب کبھی میں تین نکتے گدی ہوئی ٹھوڑی

[illegible]

نہیں بیٹی آدمی تو بُرے نہیں۔ یہ عمر کمبخت بڑی ظالم ہے۔
مگر تہمینہ نے اس سے یہ کبھی نہ پوچھا، کس کی عمر، اس کی یا ان
ے کی انگوٹھیوں والے ہاتھوں کی۔

بی اے فرسٹ ایئر میں تو آنٹی نے غضب ہی کر دیا۔ اسے
ولایت بھیج دیا۔ تہمینہ نے بہت انکار کیا۔ مگر وہ سب انتظام
تھی۔

سیکنڈ ڈویژن میں بی اے پاس کر کے وہ ایک دم خود مختار سا
کرنے لگی۔ بی اے کرنے کے بعد انسان کتنا اونچا محسوس
لگتا ہے اب وہ نوکری کر کے آنٹی کے سارے احسانوں کا
ا دے گی۔

پورٹیکو میں اندر باہر شاندار موٹریں کھڑی تھیں۔ وہ میلے سے
اور ڈھیلا شرٹ پہنے ٹیکسی سے اتری تو سب اُسے
سے دیکھنے لگے۔ بنگلہ جگمگا رہا تھا۔ اور آرکسٹرا اونچی آواز
وحشیانہ دھن بجا رہا تھا۔ ہال میں کوئی پارٹی چل رہی تھی مگر
انٹی کہیں نظر نہ آئی۔

" آنٹی کہاں ہیں ؟ "

اس نے پیچھے مڑ کر بیرے سے پوچھا۔ جو سامان اتر کر لا رہا تھا۔

" اوپر میڈم بک ہے۔ "

تہمینہ گھورنے والی آنکھوں کی زد سے بچتی تیزی سے زینے پر چڑھ گئی۔ کاش اس کا پینٹ کولہوں سے اتنا تنگ نہ ہوتا۔ آنٹی اپنے کمرے میں ڈبل بیڈ پر ڈھیر سارے تکیوں میں پھنسی پڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر ہاتھ پیر مار کر اُٹھ بیٹھی۔

" تمو ڈارلنگ ۔ " اس نے بازو پھیلا دیے اور تہمینہ ہنستی ہوئی ان میں سما گئی ۔ " میری جان میں تجھے یاد کر رہی تھی " اور میں آن پہنچی ۔ " میں نے سوچا اب کے تمہارے جھانسے میں آکر ٹلنی ٹال نہیں جاؤں گی ۔ "

" تو نے ٹھیک ہی کیا۔ میں تجھے تار ہی دینے والی تھی۔ " وہ ایک دم فکر مند ہوگئی۔

" کیا بات ہے آنٹی ۔ ؟ "

" کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ، تو ذرا نہا دھو لے، پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی ۔ "

"آنٹی ایک بات بتاؤ گی۔؟"

"پوچھو — بتانے کی ہو گی بتا دوں گی —"

"آنٹی تم میری کون ہو —؟"

"تجھے کیا لگتی ہوں۔؟"

"مجھے تو میری سب کچھ لگتی ہو۔ پر میرا تمہارا رشتہ کیا ہے!"

"تمو، مانے تو سب کچھ، ورنہ کچھ بھی نہیں — تیری نانی کی سہیلی تھی۔ تیری ماں نے کچھ نہیں بتایا —؟"

"یہی کہ تم بہت جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں اور نورانی صاحب تمہارے دوسرے میاں تھے۔"

"لو اسے فرینڈ۔۔"

آنٹی شرارت سے مسکرائی۔

"اوہ — مگر مسز نورانی۔؟"

"جب دو جنے ساتھ رہتے ہیں تو بمبئی والے انہیں میاں بیوی سمجھنے لگتے ہیں۔ بڑا ڈلیشنٹ معلوم ہوتا ہے۔"

آنٹی کھی کھی ہنسنے لگی۔ اس کی ٹھوڑی کا گوشت پھدکنے لگا۔

"نیچے یہ پارٹی کیسی چل رہی ہے۔؟"

"یہاں روز ہی پارٹیاں چلا کرتی ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں — یہ؟"

"سمجھ جاؤ گی — اس میں سمجھنے کو کیا دھرا ہے؟"

"مگر —"

"یہ گھر اب پرائیویٹ ہوٹل ہے۔"

"پرائیویٹ یعنی —؟"

"بغیر لائسنس —"

"اور شراب —؟"

"وہ بھی چلتی ہے۔ مٹھی گرم کرو یہاں، یہاں سب چلتا ہے۔"

"مگر آنٹی"

"دیکھو، تم اگر مگر کرنا ہے تو جمع کی گاڑی سے گڈ بائی۔"

"افوہ — آنٹی تم تو بات بات پر بھڑکتی ہو!"

"بھڑکوں نہیں، میرا بال بال قرض میں بندھا ہے۔ اور تُو وکیلوں جیسی بحث کر رہی ہے۔"

"اور وہ بلینک بلینس —؟"

"کبھی کا چٹ ہو گیا —"

"ہوں، سب اُڑا ڈالا۔"

پر اوندھا کر وہ ایک پیر سے کھڑی ہو کر گھوم گئی۔ ٹھوڑی پر گدے ہوئے تین سیاہ نکتے ترشول بن کر میرے کلیجے میں اُتر گئے اور وہ تمام کا تمام زہر جو اس کے وجود میں پھنکار رہا تھا۔ ہولے ہولے وجود میں رِسنے لگا۔ لوگ تماشے سے اُکتا کر اُسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ دور تک اس کے بین گونجتے رہے۔ "جے بوئی جہر لبس پیالہ۔"

پھر وہ کبھی نہیں آئی۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہے جس کے کنارے پر نُنوا کے اودے اودے مردہ ہونٹ جنم جنم کی پیاس لیے اب بھی سسک رہے ہوں گے۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، پیلی رنگت ہو رہی ہے۔"

"ارے وہ تو میک اپ اُتر گیا ہے۔ میں ابھی مرنے نہیں
ا رہی۔"

وہ بٹوے سے میک اپ نکال کر تھوپنے لگی۔

مگر تہمینہ نے دیکھا۔ عمارت کافی ڈھے چلی ہے۔ آنٹی اتنی
ڑھی کبھی نہیں لگی تھی۔ تہمینہ نے اطمینان سے پانی کے ٹب
ں پھیل کر سوچا — آنٹی کچھ چور سی نظر آ رہی ہے بوڑھی اور چور
"کیا آنٹی کے قبیلے کی عورتیں بوڑھی ہو کر چور سی نظر آنے
تی ہیں۔؟"

نہا کر اس نے طاؤسی رنگ کا ہاؤس کوٹ پہنا جو آنٹی
نے ہانگ کانگ سے منگوایا تھا۔ تولیے سے بال خشک کر کے
آ کر آنٹی کے بیڈ پہ پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

"ہاں آنٹی اب کھل جاؤ۔"

"ایں —؟" آنٹی ہکلائی۔

"تمہارے چہرے پر گانٹھیں سی بندھی صاف نظر آ
ہی ہیں —"

"شٹ اپ —"

دلاسہ دیا تو اس کا جی ٹھہر گیا۔ پھر بورڈنگ میں داخل کرا کر بمبئی لوٹ گئی۔

قلی کی مدد سے تہمینہ نے ٹیکسی لی اور پتہ بتایا۔

" کمبالہ ہل ۔ مسز نورانی جانتے ہو ؟ "

ٹیکسی والے نے ٹیڑھی آنکھیں کر کے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور مسکرا دیا۔

" مسز نورانی کو کون نہیں جانتا ۔ "

اتنے دن سے بمبئی میں رہتی ہیں ضرور سب ہی جانتے ہوں گے۔ آنٹی تھی ہی ایسی کہ اُسے جو ایک بار جان جاتے کبھی نہ بھول پاتے اس بیچاری کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ بس تہمینہ ہی تھی۔ جس پر وہ جان چھڑکتی تھی۔ بورڈنگ میں وہ کس ٹھاٹ سے رہتی۔ مہینہ میں کئی پارسل آتے۔ حلوہ، رس گلوں کے ٹن، ٹانک کی بوتلیں اور ایک سے ایک بھڑکدار کپڑے، گرمی کی چھٹی میں آنٹی اُسے نینی تال یا دہرادون لے جاتی، وہاں ایسی مزے دار پارٹیاں ہوتیں۔ رات رات بھر رقص کی محفلیں جمتیں بڑے بڑے امیر لوگ جمع ہوتے اور بڑے بڑے لوگ بڑے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے مگر آنٹی اسے اپنے پہلو سے دم بھر کو جُدا نہ کرتی۔

" آنٹی یہ لوگ اچھے آدمی نہیں ۔ " وہ پوچھتی۔

" آنٹی ایک بات بتاؤ گی۔؟ "

" پوچھو ۔ بتانے کی ہوگی بتادوں گی ۔ "

" آنٹی تم میری کون ہو ۔ ؟ "

" تجھے کیا لگتی ہوں ۔ ؟ "

" مجھے تو میری سب کچھ لگتی ہو۔ پر میرا تمہارا رشتہ کیا ہے؟

" ممو۔ مانے تو سب کچھ، ورنہ کچھ بھی نہیں ۔ تیری نانی سہیلی تھی۔ تیری ماں نے کچھ نہیں بتایا ۔ ؟ "

" یہی کہ تم بہت جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں اور نورانی صاحب تمہارے دوسرے میاں تھے ۔ "

" لو اسے فرینڈ ۔ "

آنٹی شرارت سے مسکرائی ۔

" اوہ ۔ مگر مسز نورانی ۔ ؟ "

" جب دو جنے ساتھ رہتے ہیں تو بمبئی والے [illegible] میاں بیوی سمجھنے لگتے ہیں۔ بڑا ڈلیسنٹ معلوم ہوتا ہے ۔ "

آنٹی کھی کھی ہنسنے لگی۔ اس کی ٹھوڑی کا [illegible] پھڑکنے لگا۔

" آنٹی یہ پارٹی کیسی چل رہی ہے ۔ ؟ "

"یہاں روز ہی پارٹیاں چلا کرتی ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں — یہ؟"

"سمجھ جاؤ گی — اس میں سمجھنے کو کیا دھرا ہے؟"

"مگر —"

"یہ گھر اب پرائیویٹ ہوٹل ہے۔"

"پرائیویٹ یعنی —؟"

"بغیر لائسنس —"

"اور شراب —؟"

"وہ بھی چلتی ہے۔ مٹھی گرم کرو یہاں، یہاں سب چلتا ہے۔"

"مگر آنٹی —"

"دیکھو، تم اگر مگر کرنا ہے تو صبح کی گاڑی سے گڈ بائی۔"

"افوہ — آنٹی تم تو بات بات پر بھڑکتی ہو!"

"بھڑکوں نہیں، میرا بال بال قرض میں بندھا ہے۔ اور تو وکیلوں جیسی بحث کر رہی ہے۔"

"اور وہ بینک بیلنس —؟"

"کنجی کا چٹ ہو گیا —"

"ہوں، سب اُڑا ڈالا۔"

ہاں اڑا ڈالا۔ کسی کے باپ کی کمائی نہیں تھی۔"

"مسٹر نورانی کی کمائی تو تھی۔"

"ارے وہ کیا کھا کے کماتا ۔ میرے ٹکڑوں پر پلتا تھا چپڑ کُتا۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو آنٹی ۔ یہ بنگلہ۔"

"ہاں یہ بنگلہ اور پیڈر روڈ والا مکان اور پالی ہل والی زمین ۔ اور ہیروں کے سیٹ، موتیوں کی لڑیاں دیکھے گی تو چھکے چھوٹ جائیں گے۔"

"آنٹی ۔"

"یہ آنٹی سدا سے گوشت کا لوتھڑا نہیں تھی۔ اٹھارہ اِنچ کی کمر تھی اور چالیس اِنچ کا سینہ، پنڈلیوں تک بال جاتے تھے۔"

تہمینہ سناٹے میں اپنے شانے تک بالوں کی لٹیں سکھاتی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہے یہی نا کہ میں نے تجھ جیسی شریفزادی کو حرام کی کمائی پر پالا۔ کون آج حلال کی کمائی پر پل رہا ہے۔ اس بستی میں نوکر چاکر سے لے کر مالک تک سب کی گزر حرام کی کمائی پر ہے۔ یہ اونچی اونچی عمارتیں، یہ لمبی لمبی موٹریں کیا حرام کی کمائی

کی نہیں ؟

وہ مال جو لاکروں میں بھرا ہے۔ ان کے مالکوں سے پوچھو کیسے کمایا ہے۔ اری پگلی میں تو ان سب سے زیادہ پاک باز ہوں۔ میں نے تو اپنے جسم کا دھندا کیا ہے۔ اناج کا بلیک کر کے کسی کو بھوکا نہیں مارا۔ نہ غبن کئے نہ رشوت لی۔ کھرے مال کا سودا کیا ہے۔ میری کمائی سے زیادہ حلال کی کون سی کمائی ہوگی۔

آنٹی ہنسنے لگی۔

" مگر اب کیسے ہوگیا۔؟ "

تہمینہ نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

" مشین جواب دے گئی، چرخا ٹوٹ گیا۔ " آنٹی نے اپنا سینہ کوٹ کر کہا۔ " دو دفعہ ولایت سے مرمت کرائی مگر چادر جب بُور بُور ہو جاتے تو پیوند نہیں لگتے۔ "

" ایسی تو بوڑھی نہیں ہوگئیں۔ "

" اندھی! کیا عمر ہے میری۔؟ "

" پتہ نہیں۔! "

" پھر بھی اندازاً۔؟ "

" یہی کوئی پچاس ساٹھ۔ "

"چوہتر پچھلے نومبر میں پورے ہو گئے۔ یہ کھٹارہ کب تک چلتا۔ ساٹھ برس تک تو خاصا گھسیٹا۔ پھر دھکے دیئے۔ پھر بڑھیا بیٹھ گئی۔"

"وہ بینک بیلنس۔؟"

"سب پھونک دیا۔"

"تو تم نے قرضہ لے کر مجھے نینی تال اور دہرادون کی سیر کرائی۔؟"

"ہاں کرائی۔!" آنٹی ڈھٹائی سے بولی۔ "ہنڈیں سائن کیں"

"ولایت کیوں بھیجا جب۔؟" تہمینہ رو پڑی: "ہنڈیاں سائن کر کے مجھے سیر کرا دی کیوں؟"

"ہماری مرضی۔"

"مگر۔؟"

"دیکھ تمو۔ اگر تو نے پھر مگر کہا تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ تو میرا بھیجا چاٹے گی تو قسم سے چھت پر سے کود پڑوں گی۔ ایسا کر تو صبح کی گاڑی سے چلی جا۔"

"کہاں چلی جاؤں؟ تمہارے سوا میرا ہے کون۔؟"

تہمینہ نے آنٹی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"تم گھبراؤ نہیں۔"

"میری جوتی گھبراتی ہے۔ بہت ہوا تو کھڑکی کھول کے سمندر میں اُتر جاؤں گی۔"

"نہیں آنٹی، میں بہت جلد کوئی نوکری ڈھونڈ لوں گی۔ ہم آہستہ آہستہ سب قرض چکا دیں گے۔"

"کہاں ڈھونڈے گی نوکری۔؟"

"کسی اسکول میں۔"

"کتنے پیسے ملیں گے۔؟"

"ڈھائی تین سو مل ہی جائیں گے۔ سو دو سو کی میں ٹیوشن کرلوں گی۔"

"ہوئے پانچسو۔"

"ہاں۔!"

"پانچسو میں تو بمبئی میں رہے گی اور قرضے بھی چکائے گی۔ اور یہ ہاتھی بھی چلائے گی۔"

"یہ ہاتھی ہم بیچ دیں گے ایک چھوٹا سا گھر لے لیں گے۔"

" اور روٹی میں تھولیوں گی ۔ ؟ "

آنٹی چڑ گئی۔

" کوئی معمولی سی ماما رکھ لیں گے ۔ "

" اری گدھیا، کچھ لبنت کی بھی خبر ہے۔ یہ ہاتھی نہیں بک سکتا۔ اس پر ہنڈیاں لی ہیں ۔ "

" ہنڈیاں ۔ ؟ "

" تین لاکھ کی ہنڈیاں، سیٹھ نے الٹی سیدھی سائن کرالیں میں تو مر گئی ۔ "

" اور تم نے کر دیں ۔ ؟ "

" مجھے کیا پتہ تھا موا وکیل اس سے مل گیا ہے۔ دونوں نے مل کر میری چھٹی کرادی ۔ "

" مجھے نہیں پتہ تھا تم ایسی بیوقوف نکلو گی ۔ "

" بیوقوف نہ ہوتی تو تجھ جیسی ناشکری کو ولایت کی سیر کاہے کو کراتی ۔ "

" میرے ساتھ ساتھ ٹریننگ بھی کر لوں گی ۔ " تہمینہ نے بڑے وقار سے کہا۔ " ہم ایک کمرہ لے کر رہیں گے ۔ "

" چل ہٹ میرا جی نہ جلا، پانچسو میں تو کمرہ بھی لے گی

نوکر بھی رکھے گی، روٹی کپڑا بھی کرلے گی۔ یہ کم بخت کالجوں میں آج کل کیا پڑھاتے ہیں اور تو نے یہ بھی کبھی سوچا کہ میں اپنا یہ ٹھاٹ باٹ، بنگلہ نوکر چھوڑ کر تیری کھولی میں کیوں جا کر مروں گی۔ ایک کمرے میں تو میرا دم گھٹ جائے گا تو بڑھاپے میں میری مٹی پلید کرنا چاہتی ہے۔ نا بھئی مجھے تیری مدد نہیں چاہیئے تو چھوڑ دے مجھے میرے حال پر اور جا۔"

"تمہیں چھوڑ کر تو میں اللہ میاں کے ہاں بھی نہیں جانے کی۔ اچھا یہ بے لائسنس کی بار کی چکلس تو ختم کرو۔ پکڑے گئے تو ...."

"ارے یہاں کوئی نہیں پکڑا جاتا۔ جن کی جیبیں گرم ہوتی ہیں۔ وہ خود حفاظت کرتے ہیں۔ بمبئی میں آدھے سے زیادہ دھندے اندھا دھند سے چلتے ہیں۔ لائسنس لینے جاؤ تو سو لفڑے ہیں قدم قدم پر پیسہ بھی بھرو اور ناک بھی رگڑو نہیں تو برسوں کام نہیں ہو پائے گا۔ اور پھر بنگلہ سیٹھ کے قبضہ میں ہے۔ آج کان پکڑ کے نکال دے تو کوئی اس کا کیا کرے گا۔"

"بس اب ایک ہی راستہ ہے تم میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں۔؟"

"کہیں بھی جھونپڑے میں رہیں گے مگر عزت سے۔"

" چل سڑک، کہیں جھونپڑے میں بھی کوئی عزت سے رہتا ہے کہاں کی پرانی سڑی باتیں بگھار رہی ہے ۔"

آنٹی نے بڑے رشک کی نگاہوں سے تہمینہ کو تاکا ۔ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی ۔ " سیٹھ رزاق بھائی کروڑ پتی ہے ۔ ہر بینک میں اس کا اکاؤنٹ ہے سینماؤں کی لین ڈوری لگی ہے ۔ شہر کے ہر بڑے ہوٹل میں حصہ دار ہے ۔ پھر بھی اس کا جی نہیں بھرتا ۔ مجھ جیسی گدھیاں ممبئی میں بہت پڑی ہیں ۔ ان کے گھر اس نے رنڈی خانے بنا رکھے ہیں ۔"

لفظ " رنڈی خانہ " پر تہمینہ چونک پڑی ۔

" آنٹی، تمہارا بنگلہ بھی رنڈی خانہ ہے ۔؟"

" اب جو چاہو نام دیدو ۔ نہ رنڈی کے سر پہ سینگ ہوتے ہیں ۔ نہ منہ پر کسی کے لکھا ہوتا ہے ۔ بس اتنا ہے کہ شوقین مزاج آتے ہیں ۔ کمسن خوبرو لڑکیاں آتی ہیں ۔ شراب کے دور چلتے ہیں شوخی شرارت چلتی ہے ۔ اب میں ایک ایک کمرے میں جھانک کر تو دیکھتی نہیں کہ وہاں کیا ہوتا ہے ۔"

" جو روپیہ آتا ہے وہ کہاں جاتا ہے ۔؟"

"حساب سیٹھ کا آدمی جانے میرے حصے میں سے کچھ سود میں کٹ جاتا ہے۔ کچھ میں لے لیتی ہوں، میں کچھ کم ٹھاٹ سے نہیں رہتی اور کیوں نہ رہوں ۔ دینا تو ہے ہی جتنا بھی ہاتھ آ جائے اچھا ہے اوپر سے خرچے ہوتے رہتے ہیں۔ کمروں میں نیا فرنیچر میرے حساب میں ہی پڑا۔ اُوخ! میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

"بڑا ہی ذلیل آدمی ہے۔"

"میری جان یہ دولت بڑے جتن کرنے سے جُڑتی ہے ایک زمانہ تھا، جب سیٹھ رزاق بھائی فٹ پاتھ پر سویا کرتا تھا ۔ لوگوں کے لئے ٹیکسیاں پکڑ کے لایا کرتا تھا۔ پھر چھوکریاں سپلائی کرنے لگا۔

اس چکر میں بڑے بڑے لوگوں سے سابقہ پڑنے لگا۔ اور بڑے ہوٹلوں تک پہنچ ہوگئی ۔ پڑھا لکھا خاک نہیں ۔ مگر آدمی ہوشیار ہے۔ اسمگلنگ کا مال سنبھالنے لگا۔"

"وہ کیسے ۔؟"

"کیا پتہ کچھ اڈے مقرر ہیں۔ وہاں تھوڑا تھوڑا مال پہنچا ہوتا ہے ۔"

"اپنا گھر بھی اڈا ہے۔"

"ہوگا، ہوگا کیا ہے، سیٹھ کا جہاں بھی عمل دخل ہے وہاں یہ سب کچھ چلتا ہے۔"

"اور جو چھاپہ پڑ جائے تو تمہاری شامت نہیں آئے گی۔؟"

"مجال ہے جو میرے گھر پہ چھاپہ پڑ جائے۔ مجھے آدھا بمبئی جانتا ہے۔ سیٹھ میرے نام سے بیسیوں چندے دیتا ہے، کتنے ہی اسکولوں، ہسپتالوں اور یتیم خانوں کی کمیٹی پر میرا نام ہے اندر کا حال کسی کو کیا معلوم باہر تو میرے نام کے جھنڈے گڑے ہیں۔ میں مروں گی تو تین دن تک آکاش وانی سے ماتمی نغمے نشر ہوں گے میرے جنازے کے ساتھ بڑی بڑی توپیں شامل ہوں گی — ٹیلی ویژن پر تو یقیناً میرے جنازے کا جلوس دکھایا جائے گا۔"

آنٹی اپنے مرنے کے ذکر پر جھوم اٹھی۔

"پھر —؟"

"پھر کیا ہوگا؟ یہ اللہ ہی جانے سیٹھ سے بنی رہی تو شاید عقبیٰ کا بھی کچھ انتظام ہو جائے گا۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ آبِ زمزم میں ڈبویا ہوا کفن جس پر زعفران سے ساتوں کلمے لکھے ہیں۔ میرے لئے منگوا دے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے عیب

ڈھانکنے والا ہے وہ رحیم و کریم ہے۔ ستار العیب ہے۔"

"تب تو سیٹھ سے بنائے رکھنا چاہیئے۔"

تہمینہ اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔

"یہی تو میں کہہ رہی تھی مگر تمہاری سمجھ میں آئے جب نا۔"

تہمینہ ایک دم ٹھٹک کر مڑ گئی۔

"میری سمجھ کا اس میں کیا دخل ہے؟"

"اب نبومت، سیٹھ اس وقت خالی ہے۔"

"سیٹھ۔"

"سیٹھ خالی ہے مگر میں اسے کیسے بھر سکتی ہوں؟"

آنٹی خاموش رہی۔

"کیا وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں اُس کتے سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔"

"یہ کچھ عقل کی بات کہی تم نے، اس کی پہلے بھی دو بیویاں ہیں۔ نئی شادی سے اس کی ساکھ پر آنچ آئے گی۔ وہ تو دوسری بیوی کے چکر میں بھی اپنی حماقت سے پھنس گیا، نکاح کرنا پڑا۔ مگر وہ اُسے مکھی کے گُو کیطرح چھپاتا ہے، کہیں باندرہ میں رہتی ہے۔ ساتھ آتی جاتی نہیں۔"

" اور پٹیل بیوی ؟ "

" وہ بیچاری ضعیف ہوگئی ہیں. سیٹھ سے کئی سال بڑی ہیں۔ اوپر سے سفید داغ کا روگ ہے۔ "

" تم مجھ سے کیا کہنے کی کوشش کر رہی ہو ؟ میرا اندازہ غلط نہیں تو تم مجھے سیٹھ کی داشتہ بننے کی رائے دے رہی ہو۔ "

آنٹی زور سے کھنکاری ادھر کے تکیے اُدھر پٹخے پھر کڑ کڑ مرغی کی طرح گھونسلے میں جم گئی.

" اب میں سمجھی تم نے مجھے کیوں اس لاڈ پیار سے پالا تھلوں کے ڈھیر لگائے ؛ پہاڑوں کی سیر کرائی، ولایت بھیجا کہ ایک دن جب بیری پک جائے گی تو بانس لے کر جھاڑ لوں گی۔ "

مارے غصے کے تہمینہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگی. اس کا جی چاہا کہ اس مٹول احمق سی عورت کو اٹھا کر زور سے زمین پر پٹخ دے کہ وہ سڑے گلے سیب کی طرح پھٹ کر چیتھڑے ہو جائے۔ "

" ٹھیک کہتا تھا سیٹھ زیادہ نہ پڑھاؤ۔ بی اے، ایم اے لڑکیاں بے لگام ہو جاتی ہیں۔ چار سال پہلے اگر میں نے اس کا کہنا مان لیا ہوتا تو آج تیرے یہ کس بل نہ دکھتی۔ دیکھتی ہوں

تو کیا تیر مارتی ہے کیسے دو سو روپلی میں راج رچاتی ہے۔ غارت ہو مردار ــــ "

" میں راج نہیں، جینا چاہتی ہوں، میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"

" تو جا ٹھوکریں کھا۔

" ہاں میں ٹھوکریں کھانا چاہتی ہوں۔ "

" تو جا مر، کسی اپنے جیسے کنگال سے بیاہ رچا کے کولہو میں جُت جا۔ ایک اشارے پر دنیا بدل سکتی ہے۔ سارا قرضہ بیباق، یہ بنگلہ تیرے نام اور پسند کی موٹر ..... ایک تھرڈ کلاس شوہر سے ایک فرسٹ کلاس سیٹھ کی داشتہ بننے میں زیادہ منافع ہے۔ ذرا سوچ تو کتنے آرام ہیں۔ "

" مجھے آرام نہیں چاہیئے۔ میں سیف میں بند ہو کر عفونت زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ میں کنکروں پر ننگے پیر چلنا چاہتی ہوں۔ میں کانٹوں سے الجھنا چاہتی ہوں۔ میں آندھیوں میں اڑنا چاہتی ہوں۔"

تہمینہ نے جلدی جلدی اپنا ادھ کھلا سوٹ کیس پیک کیا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ دنیا کتنی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ تکیوں کے ڈھیر پر بیٹھی آنٹی چربی کا ایک کثیف لوندا لگ رہی تھی۔

واپس بمبئی سنٹرل کے پلیٹ فارم پر وہ کتنی اکیلی کھڑی تھی، ڈیڈی کے سینے کا کینسر آج اس کے اپنے سینے پر اُمڈ رہا تھا۔ ممّی کی آخری سانسیں اس کے گلے میں اٹکی ہوئی تھیں۔ سارے رشتے سارے ناطے ایک ایک رگ کی طرح کٹ چکے تھے۔ انجانی نسوں سے خون کے دھارے بہہ چکے تھے۔ آج آخری ڈوری بھی وہ کاٹ آئی۔ آنٹی اپنی تھی تو دنیا کتنی بھری بھری نظر آ رہی تھی۔ اتنی دور سے بھی اس کے چاروں طرف احاطہ کئے رہتی تھی۔ اس کے وجود کا احساس کتنا بھاری بھرکم تھا۔ اس کے احسانوں کے بوجھ سے کلیجہ بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ اس کے احسان اُتارنے آئی تھی۔ اُسے دلدل میں پھنسا چھوڑ کر بھاگ آئی۔ بڑھیا کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ابھی گاڑی کی روانگی میں دیر تھی مگر اُسے پلیٹ فارم گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک دم جیسے پلیٹ فارم پر بھونچال آ گیا۔ وہ گاڑی کے نیچے گرتے گرتے بچی۔

آنٹی ایک بھڑکدار فٹ بال کی طرح جیسے گول کرنے کا تہیہ کئے فُل اسپیڈ سے چلی آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ قلیوں کی قطار تھی۔ ان گنت سوٹ کیس، پوٹلیاں تھرماس اور ڈبے تھے آنٹی بڑے زور زور سے کسی ریلوے کے افسر سے لڑ رہی تھی خوب

کھینچا تانی ہوئی، آنٹی ہر چہار طرف دس دس کے نوٹ اچھال رہی تھی۔
تہمینہ کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ اس کی مٹھی ہی میں رہا۔ اور آنٹی فرسٹ کلاس ائرکنڈیشنڈ کی دو سیٹوں پر قبضہ کر کے ڈٹ گئی۔
وہ تہمینہ کا ہاتھ ایسے دبوچے تھی کہ اگر ذرا ڈھیلی دیدی تو وہ پھر سے اُڑ جائے گی۔

بڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے سے آنکھ چراتی رہیں۔ پھر آنٹی نے تھرماس کھولا اور خونخوار آنکھوں سے تہمینہ کو گھور کر دھنسی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں نے تجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ میں چوہتر برس کی ہوں۔ میں سوچا تھا تیرا دل پگھل جائے گا مگر آج مجھے پتہ چلا کہ تو کیسی پتھر دل ہے مگر کہے دیتی ہوں نہ میں کنکروں پہ ننگے پیر چلوں گی نہ تیرے کانٹے اور آندھیاں میرے بس کی ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو میری جان میں تمہیں گود میں اُٹھا کر ساتوں سمندر کر لوں گی۔" تہمینہ نے آنٹی کی گود میں سر رکھ دیا۔
تب اس کے ماتھے پر ایک گرم گرم پانی کی بوند ٹپکی اور وہ بن گئی۔